U16532 2-12-09

Title - Shoray Usr Ke Kalaam Ka Intikhab-E-Jadeed 1914 - 1942

Creator - Murattibq Aziz Ahmad Aur Aal Ahmad Sarwar.

Publisher - Anjuman Taraqqi Urdu Pakistan (Karachi)

Date - 1950

Pages - 264

Subjects - Urdu Shayari - Intikhab Kalaam

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (پاکستان) نمبر ۱۹۶

شعرائے عصر کے کلام

کا

انتخابِ جدید

سنہ ۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹۴۲ء

مرتّبہ

جناب عزیز احمد صاحب اُستاد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

و

جناب آل احمد صاحب سرور اُستاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی

بار دوم — سنہ ۱۹۵۰ء — قیمت مجلد ۸ بلا جلد ۸

۲۸-۳۱
۷۸-۱۰۳
۱۰۴-۱۰۹

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (پاکستان) نمبر ۱۹۶

شعرائے عصر کے کلام

کا

انتخابِ جدید

سنہ ۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹۴۲ء

مرتبہ

جناب عزیز احمد صاحب استاد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

و

جناب آل احمد صاحب سرور استاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی

فہرست مضامین

اُردو شاعری میں کسی زمانے میں اتنا تنوّع نہ تھا جتنا آج کل ہے۔ یہ تنوّع ہماری زندگی سے آیا ہے۔ جنگِ عظیم نے ساری دُنیا کو ایک سی رحمتیں اور لعنتیں عطا کیں اور ہندوستان بھی چونکہ ذہنی اعتبار سے متمدّن دُنیا سے کچھ بیگانہ سا ہو رہا تھا اس سے اپنا دامن محفوظ نہ رکھ سکا۔ جنگِ عظیم سے پہلے ہماری شاعری ایک خاموش اور پُرسکون دریا کی طرح تھی، اس کے بعد اس میں طوفانوں کی تیزی اور بے مہری، تباہی اور غارت گری اور زرخیزی اور زندگی آگئی۔ اُنیسویں صدی کے آخر میں لبرل تحریک زوروں پر تھی۔ جنگ سے پہلے تک اس کا اثر رہا، چنانچہ ہندوستان میں بھی ایک متین، سنجیدہ، شریفانہ، مدھم سی تحریک اصلاح اور آزادی کے لئے ہو رہی تھی۔ حالی نے زمانے کی رفتار چلنا سکھایا تھا، زندگی کی تلخیوں اور حقیقتوں کا احساس دلایا تھا۔ شاعری کو انسانیت کا علَم بردار بنانے کی کوشش کی تھی، اُن کی یہ کوشش بارآور ہو رہی تھی۔ مخزن میں جدید طرز کی نظمیں لکھی جا رہی تھیں، وطن کی محبّت، مناظرِ فطرت، ماحول کی عکاسی، قومی اور سیاسی بیداری، انگریزی نظموں کے ترجمے، سب کچھ ملنے لگے تھے۔ مگر ابھی تک امیر و داغ کے چٹ پٹے اشعار مزا دیتے تھے۔ لوگ حالی کی "اُبالی کھچڑی اور بے نمک سالن" کی ضرورت تو محسوس کرتے تھے مگر جان اُسی گرم مسالے پر دیتے تھے جو رندانہ اور بوالہوسانہ غزلوں کی شکل میں انہیں ملتا تھا۔ اقبال کے پہلے دور کی شاعری چکبست کی قومی نظمیں، سرور جہاں آبادی، وحید الدین سلیم، خوشی محمد ناظر، نظم طباطبائی،

دیباچہ

شوقؔ قدوائی کی نظمیں، اور عزیزؔ لکھنوی، ثاقبؔ لکھنوی، ریاضؔ خیرآبادی، شادؔ، حسرتؔ وغیرہ کی غزلیں جنگِ عظیم سے پہلے کے مزاج کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس جنگ نے پچھلے دور کے اور ہمارے درمیان اتنی بڑی خلیج حائل کر دی ہے اور ہمارے ذہن کو اس قدر بدل دیا ہے کہ اب ہمارے لیے اس مزاج کا تصور بھی آسان نہیں۔

ادب میں کوئی ایک سال مشکل سے حدِّ فاصل کیا جا سکتا ہے، مگر ۱۹۱۴ء بہت بڑی حد تک ایک بساط کے الٹنے اور دوسری کے بچھنے کو ظاہر کرتا ہے۔ دراصل کوئی ادبی بساط اس طرح نہیں بدلی جاتی جس طرح کیلنڈر کے اوراق بدلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو اس انتخاب میں جنگِ عظیم سے پہلے کی چیزیں بھی کافی مل جائیں گی اگرچہ ہمارے ذہنی سفر کے لیے ۱۹۱۴ء اس وجہ سے اور بھی موزوں ہے کہ اسی سال حالیؔ اور شبلیؔ کا انتقال ہوا۔ کوشش کی گئی ہے کہ ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک کے تمام اہم شعرا کا انتخاب آ جائے۔ ممکن ہے کہ بعض اشخاص کو اپنے محبوب شعرا اس میں نظر نہ آئیں یا ان کے لیے صفحات میں اتنی گنجائش نہ نکلی ہو جتنی دل میں ہے۔ مگر اس انتخاب میں صرف اچھی اچھی نظمیں اور غزلیں جمع کرنا مقصود نہ تھیں۔ پورے دور کی ایک نمایندہ تصویر مرتب کرنی تھی۔ موجودہ شاعری کے صرف جدید شاعری کے نہیں ہیں۔ اس میں قدیم رنگ کے نمونے بھی اپنی بہار دکھاتے ہیں اور سب مل کر ایک قوسِ قزح کی سی کیفیت پیدا کرتے ہیں، مگر چوں کہ جدید اثرات ہمارے سماج پر اس وقت زیادہ اثر انداز ہیں اس لیے اُن کا تناسب قدرتی طور پر زیادہ ہے۔

۱۹۱۴ء سے پہلے تک نظموں پر حالیؔ کا اثر تھا اور غزلوں پر داغؔ اور امیرؔ کا۔ مگر بڑی بات یہ تھی کہ غزل کی دنیا میں ایک خاموش تبدیلی ہو رہی تھی۔ غالبؔ اور میرؔ لکھنؤ کے دل میں گھر کرتے جا رہے تھے اور اگرچہ لکھنؤ کی اپنی ادبی روایات سب موجود تھیں مگر غالبؔ کے خیال کو میرؔ کی زبان میں ادا کرنے کی کوشش جاری تھی۔

دیباچہ

اُنیسویں صدی کے آخر میں لکھنؤ کچھ اپنی چار دیواری کے اندر بند ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ یہ قلعہ بندی اس قدر مضبوط تھی کہ جب سارا ملک حالی کے نغموں سے گونج رہا تھا۔ اُس وقت بھی لکھنؤ حالی کا مذاق ہی اُڑاتا تھا۔ مگر وہ غالب کو اپنے دل میں جگہ دے رہا تھا۔ عزیز لکھنوی اگرچہ قدیم رنگ کے شاعر ہیں مگر جہاں تک لکھنؤ کا تعلق ہے وہ انقلابی کہے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے اور ثاقب لکھنوی نے ناسخ کے بجائے غالب سے فیض حاصل کیا۔ وہ ناسخ کو چھوڑ نہ سکے، مگر غالب کو اپنانے کی کوشش میں خود بن گئے۔ اس تحریک سے بڑے خوش گوار نتائج مرتب ہوئے۔ اُس نے لکھنؤ میں میر کو پھر روشناس کرایا اور اثر کو پیدا کیا۔ میر کو صرف لکھنؤ ہی میں نہیں، دوسرے مرکزوں میں بھی، اُن کی اصل جگہ ملی، شاد نے ان کی سی طویل بحروں میں ایک عجیب و غریب تھرتھراہٹ پیدا کی، حسرت نے اُس مصحفی کو پہچانا جو میر سے متاثر تھا اور اُسے اس کا اصلی مقام دیا۔ فانی جب غالب کے ساتھ چلتے چلتے تھک گئے تو میر نے اُنھیں سہارا دیا۔ چناں چہ تقریباً ۱۹۲۰ء تک غزل میں شروع شروع میں امیر و داغ اور بعد میں غالب و میر کا پرتو نظر آتا ہے۔

نظم کی دُنیا، اُردو شاعری میں پہلی مرتبہ، غزل سے کسی طرح ہیٹی نہیں۔ اس میں حالی و شبلی کے بعد اسمٰعیل، اکبر، چکبست، اقبال، سلیم، سرور جہاں آبادی، شوق قدوائی اور بے نظیر شاہ وغیرہ کے نام ممتاز ہیں۔ ان کے یہاں ایک نیا ذہن ایک نیا احساس اور ایک نیا جذبہ ملتا ہے۔ ان میں انتہا پسند کوئی نہیں اور اکبر تو قدامت پرست اور تنگ نظر ہیں مگر پچاس برس پہلے کے شاعر ان کا کلام سُنتے تو حیران رہ جاتے۔ وطن سے محبت، وطن کے ماضی کی سنہری تصویریں، اس کی تاروں بھری راتیں۔ اور ٹھنڈی ہوائیں، اس کے لہلہاتے ہوئے میدان، اور گنگناتے ہوئے دریا، ہر شاعر کے دل میں بسے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان

چیزوں کو جو صدیوں سے یہاں موجود تھیں، لوگوں نے پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ اور واقعی اس
ملک کے باسیوں کو اپنے وطن کی محبت کا یہ احساس پہلی دفعہ اتنی شدت سے ہوا تھا
کہ اس کی ایک مشتِ خاک کے بدلے بہشت بھی لینے کو تیار نہ تھے۔ یہ احساس مغربی
تعلیم کا بھی نتیجہ تھا اور ہندستان کی سیاسی جد و جہد کا بھی۔ اُن لوگوں کے لیے جن کی
آنکھیں صرف اندر کی طرف کھلتی تھیں اور جو صرف اپنے من کی دُنیا میں مست رہتے
تھے یہ فطرت کا مشاہدہ اور ماحول کا مطالعہ کچھ نیا نیا سا تھا اور نیا ہونے کی وجہ سے کچھ عجیب
بنا۔ اس دوران میں جتنی نظمیں مقامی اثرات کی حامل ہیں شاید نظیر کے بعد کسی دور میں بھی نہیں۔

ایک طرف اسمٰعیل، چکبست، بے نظیر اور سرور جہاں آبادی اِس نئی
ہندستانیت کی مصوری کر رہے تھے، دوسری طرف اکبر جو ایرانی ہندستانیت
یا مشرقیت کے پرستار تھے، مغربی تہذیب کے طوفان سے اسے محفوظ رکھنے کی کوشش
کر رہے تھے۔ ایک اپنی وضع کو بدلنا چاہتا تھا، دوسرا اس پر قائم رہنا چاہتا تھا۔
اکبر کی شاعری میں طنز و ظرافت کی بڑی بلند پایہ مثالیں ملتی ہیں۔ مگر ان کی شاعری ایک
پُھلجھڑی ہے اُن کے یہاں خندہ نہیں اصل میں نہیں گریہ ابر بہار بھی ہے۔ اُن کے
نشتر اپنے اندر ایک بڑی المیہ داستان رکھتے ہیں۔ مشرقیت کا یہ پرستار ہر چیز
کو جذبات کی عینک سے دیکھتا تھا اور ہر نئی چیز کے سائے سے بھڑکتا تھا اُس نے
ساری عمر بتوں کے عشق میں گزاری تھی اور آخر میں باخدا رہنا چاہتا تھا۔ مگر اب
اس کے راستے میں ؟ حائل ہوتی تھی۔ اُسے یہ تو معلوم ہو گیا تھا
کہ "ٹلتی نہیں آئی ہوئی"، مگر پھر بھی اس نے مغربی تہذیب، مغربی معاشرت اور
مغربی سیاست پر ایسے وار کیے کہ مغربیت کے خلاف ردِّ عمل جلد شروع
ہو گیا۔ اکبر نے اپنے بعد اقبال کو چھوڑا جو اگرچہ مغرب سے بہت کچھ لے چکے تھے۔ مگر
اُس سے بہت بیزار تھے اور دوسری طرف ظفر علی خاں اور ظریف لکھنوی کو۔

ظفر علی خاں اگر سیاست سے ذرا علیحدہ رہتے تو وہ دوسرے اقبال ہو سکتے تھے۔ ہاں یہ تصور بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اگر اقبال سیاست میں اور زیادہ پڑ جاتے تو وہ ظفر علی خاں کی سطح پر اتر آتے یا نہیں؟

(اقبال کی شہرت یوں تو ترانۂ ہندی، شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع و شاعر، جیسی نظموں سے سارے ملک میں ہو چکی تھی، مگر اس وقت تک وہ درحقیقت مقلد تھے۔ ان کی وطنی شاعری حالی اور مخزن کی تحریک سے متاثر تھی، ان کی اسلامی شاعری مسدس اور اکبر کے نشتروں سے، گو ان کے فلسفہ اور مغربی تہذیب و تمدن کے مطالعے نے اس میں گہرائی، واقعیت اور ایک انوکھا پن ضرور پیدا کر دیا تھا۔ وہ اس وقت تک مصور تھے، لیکن خضرِ راہ کی اشاعت سے وہ ذہنی آتش فشاں اپنی اصل شان سے نمودار ہوتا ہے جس کا نام اقبال ہے۔ خضرِ راہ بظاہر صرف عالمِ اسلامی کے انتشار اور جنگِ عظیم کے تاثرات پر ایک دکھے ہوئے دل کی پکار ہے۔ مگر دراصل وہ ایک مفکر شاعر کا عہد نامۂ جدید (NEWTE.STAMENT) ہے۔ اس سے پہلے جنگ کا اثر ہندستان میں کسی نے اتنا محسوس نہیں کیا تھا اور نہ کسی نے اتنے اعتماد سے "ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم" چھوڑ کر آفتابِ تازہ کا خیر مقدم کیا تھا۔ سیاسی الجھنیں، اقتصادی مسائل، شہنشاہیت کے خلاف جہاد، غرض وہ سب چیزیں جو ہماری زندگی کا جزو بن گئی ہیں، اقبال کے خضرِ راہ کے ذریعے سے ادب بنیں، اس کی حیثیت انقلابی ہے۔

جنگِ عظیم کے بعد ہندستان میں ایک جذباتی سیلاب آیا۔ یہ سیلاب کچھ تو ان امیدوں کی وجہ سے پیدا ہوا جو جنگ کے دوران میں ہندستانیوں نے انگریزوں سے وابستہ کی تھیں اور جن کے صلے میں انھیں رولٹ ایکٹ، مارشل لا اور جلیانوالا باغ ملا، اور کچھ ترکی سے ہمدردی کی وجہ سے۔ جذبات کے اس

سمندر میں پورے ہندستان نے ایک ساتھ غوطہ لگایا اور اپنی رگ و پے میں ایک خاص توانائی محسوس کی۔ ایک بہتر دن کی خواہش، ایک نئے دور کی تلاش، ایک نئے نظامِ زندگی کی نوید صرف طلوعِ اسلام کے آخری بند ہی میں نہیں ساری اُردو شاعری میں ملنے لگتی ہے۔ ہمارے شاعر اب 'تھا' کی بجائے 'ہوگا' اور 'کرتے تھے' کے بجائے 'کریں گے' کے تصور سے مست ہونے لگتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھیں اُفق پر گاڑے ہوئے ایک آنے والے زمانے کا خواب دیکھنے اور دکھانے لگتے ہیں۔ وہ اپنے سُنہرے خوابوں کی دُنیا میں پہنچ کر تھوڑی دیر کے لیے حال کی تلخیوں اور مایوسیوں کو بھی بھول جاتے ہیں۔ اُن کی ذہنی زندگی کو غذا مغرب کے دیئے ہوئے تصورات سے ملتی ہے۔ مغرب اُنھیں آفاقی نظر دیتا ہے اور مجلس اقوام کا مرمریں بت اُن کے سامنے پیش کرتا ہے۔ سوشلزم، سائنس کے کرشمے، میکانیکی زندگی کی برکات، عورتوں کی آزادی، عام تعلیم کا نصب العین نوجوان کے ذہن کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ مغرب کی نعمتوں پر نظر جم کر رہ جاتی ہے، اُس کی لعنتیں جو پوشیدہ ہیں، نظر نہیں آتیں نئی نسل ذہنی اعتبار سے اور زیادہ مغربی ہوتی جاتی ہے اور مشرق اور مشرقیت سے بیزاری عام ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد سے اب تک جو کچھ ہوا وہ طلسم ہو نہ ہو ہوش ربا ضرور رہی۔ بیس سال کے تھوڑے سے عرصے میں زندگی کی رفتار تیز ہوگئی ہے۔ ذہن زیادہ حساس ہوگیا ہے، نفسیاتی شعور بڑھ گیا ہے۔ چیزوں کو توڑنے اور پھر سے جوڑنے، بت شکنی کرنے اور نئے بت بنانے کا شوق ہے، انقلابی تصورات صرف سیاسی مسائل ہی میں نہیں زندگی کے ہر شعبے میں دخیل ہیں، ساری دُنیا ایک مرکز پر آگئی ہے۔ سائنس نے علمی دُنیا ہی میں نہیں شعر و شاعری میں بھی دخل پالیا ہے۔ جنگِ عظیم سے پہلے کی پُرسکون فضا میں ادبِ لطیف کی ذہنی عیاشی شروع ہوئی تھی جنگِ عظیم

کے بعد اس کی جگہ ترقی پسندی کی ننگی تلوار نے لے لی۔ الہلال اور ٹیگور کے ایک غلط تصور کی وجہ سے بلند آہنگ ترکیبیں رائج ہو گئی تھیں۔ اب (اقبال کے باوجود) حالی کی طرف پھر رجحان ہونے لگا۔ قدیم غزل نے جس ماورائیت، تفلسف، تصوّف، انفرادیت، انانیت کا علم بنا رکھا تھا وہ شکست ہوتا گیا۔ غزل میں وہ نفاست نہ رہی مگر جان زیادہ آگئی، اس کی وہ بندھی ٹکی شریفانہ مگر مریض زبان جس میں زندگی کم تھی، روایات زیادہ اور جس کا رس پرانا ہونے کی وجہ سے تیزاب ہو گیا تھا۔ بدلی اور اپنی آزادی کو محسوس کرنے اور کرانے کے لیے لوگوں نے زبان کے ساتھ خوب خوب بے اعتدالیاں کیں، وہ رعایتیں اور صنعتیں، وہ اشارے اور کنائے جن پر ذوق جیسے شاعر جان دیتے تھے اب کراہت پیدا کرنے لگے۔ آزاد کا بیان ہے کہ ذوق نے ظفر کو ایک شعر دینے سے انکار کر دیا تھا جس میں صرف یہ خوبی تھی کہ آنکھ کو بادام سے تشبیہ دی گئی تھی۔ یہ نیا مزاج ہمیں آج کل کی غزلوں اور نظموں سب میں مل جائے گا۔

راہوں، تصوروں اور آرزوؤں کی اس بھول بھلیاں میں بھی جسے ہم آج کل کی ادبی زندگی کہتے ہیں، بعض چیزیں صاف نظر آسکتی ہیں۔ مغربی شاہکاروں کے ترجمے، مغربی طرز کی نظمیں، مغربی اسلوب کی نقالی اور مغرب کے اثر سے مشرقیت کا ایک نیا احساس، یہ سب ہمیں جنگ کے بعد بڑے جوش و خروش سے ملتا ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری اور عظمت اللہ خاں دونوں پختگی کو نہ پہنچنے پائے، جوانی میں ہم سے رخصت ہو گئے۔ مگر دونوں کا ہم پر بڑا احسان ہے، جس کا پورا پورا اعتراف ابھی کیا نہیں گیا۔ شاید اس لیے کہ وہ باغی تھے اور باغیوں کو لوگ سزا دیتے ہیں انھیں ہار نہیں پہناتے۔ عظمت اللہ خاں نے رسمی غزل کے خلاف حالی سے زیادہ سختی سے آواز بلند کی۔ انھوں نے اُردو کے عروض کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی۔ خود نئے طرز کی نظمیں

لکھیں اور اُن میں سے بعض ہماری شاعری میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ انھوں نے اور بھنوری نے تازگی اور جدّت کی ایک لہر پیدا کی اور صرف انگریزی کی بجائے یورپ کے دوسرے ادبیات کی چاشنی بھی ملائی۔ اُردو میں سانیٹ کو مقبول بنانے میں اختر شیرانی کا بھی حصّہ ہے جنھوں نے اپنی سلمیٰ کو زندہ جاوید کرنے کے لیے زیادہ تر یہی صنف پسند کی۔ ترقی پسند ادب نے حال میں بے قافیہ نظم اور آزاد نظم BLANK VERSE FREE VERSE کی طرف جو توجہ شروع کی ہے وہ ابھی رجحانات کا نتیجہ ہے جو گزشتہ بیس سال سے نمایاں ہو رہے تھے۔ یہ محض زبان سے ناواقفیت یا فن سے بے نیازی کی غماز نہیں ہے۔ اس میں بعض سہولتیں اور آسانیاں ہیں۔ اس میں خیال پر اتنی پابندی نہیں ہوتی، روانی اور تسلسل کے راستے میں اتنے بند نہیں ہوتے۔ ایک آواز کو گم کرنے کے لیے سینکڑوں پیش رووں کی اتنی آوازیں نہیں ہوتیں جتنی مروجہ غزل اور نظم میں ہوتی ہیں۔ ابھی یہ صنف اُردو میں بالکل نو وارد ہے، اسے ہمدردی اور رواداری سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے شعرا کی فطرت سے ہم آہنگ ہوسکی تو اس سے اُردو کو یقیناً فائدہ پہنچے گا ورنہ اپنے آپ ختم ہو جائے گی، فیض، راشد کے یہاں آپ کو اس کے بعض قابلِ قدر نمونے مل جائیں گے۔

میں نے ابھی اشارہ کیا تھا کہ مغرب نے ایک مخصوص طریقے سے ہماری مشرقیت کو اُبھارا ہے۔ سجاد حیدر نے ترکی ادب سے ہمیں روشناس کرایا۔ ظفر علی خاں نے جنگِ روس و جاپان پر ایک ڈرامہ لکھا مگر یہ راس مسعود مرحوم کی خوبی تھی کہ پیشہ ور ادیب اور شاعر نہ ہوتے ہوئے انھوں نے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو جاپان کی طرف متوجہ کیا۔ جاپان اور حال میں چین کے اصنافِ سخن کا عکس بھی ہمارے ہاں ملنے لگا ہے۔

عظمت اللہ خاں صرف مغرب سے اثر کے نمایندے ہی نہیں۔ انھوں نے غالباً حالی نے سب سے زیادہ ہمارے شعرا کے طرز کو ہندی سے قریب کیا ہے۔ مقبول حسین احمد پوری، اندرجیت شرما، حفیظ، ساغر، افسر سب کے یہاں ہمیں ہندی کا گہرا اور رچا ہوا اثر ملتا ہے۔ یہ سب غنائی شاعر ہیں اور گیتوں کے لیے ہندی کے خزانے زیادہ موزوں ہیں۔ ان شعرا سے پہلے بھی ہمارے یہاں گیت اور دوہے تھے مگر پہلے شاعر تفریح طبع کے طور پر کہتے تھے۔ اُن کا مقصد محض اپنی قادرالکلامی ظاہر کرنا ہوتا تھا۔ ان شعرا نے غزلوں اور مروجہ نظموں کے برابر گیتوں کو بھی مقبولیت عطا کی اور اس مقبولیت کو فلم اور ریڈیو اور گراموفون ریکارڈ نے اور زیادہ چمکایا اور پھیلایا جب ہمارے فلموں میں اچھے گیت لکھے جانے لگیں گے (آرزو لکھنوی اور حشر کے یہاں بعض اچھے گیت ملتے ہیں مگر عام طور پر اُن کا ادبی معیار قابلِ اطمینان نہیں ہے) تو اس سے ہماری شاعری کو بھی فائدہ پہنچے گا۔

۱۹۲۰ء سے تقریباً ۱۹۳۲ء تک کا دور انگریزی ترجموں، گیتوں، تجربوں اور ہندی آمیز نظموں کا دور ہے ۱۹۳۳ء سے لے کر ملک میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوتا ہے اور گزشتہ سات آٹھ سال میں اس نے ہمارے ادب کو اپنے بموں سے خاصا دہلا دیا ہے۔ مگر یہ بم آتش گیر اتنے نہیں جتنے چیخنے والے ہیں۔

NOT INCENDIARY BUT SCREAMING BOMBS

ترقی پسندی کی تحریک جرمن تحریک کی طرح اپنے سوا ہر چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے ورنہ ہمارے ادبی سرمایے ہیں ترقی پسند عناصر برابر کام کرتے رہے ہیں اور کسی زمانے میں انھیں کوئی کچل نہیں سکا ہے مگر اس غلو اور جوش کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کی وجہ سے ہمارے ادب میں بعض اچھی باتیں آگئی ہیں۔ اس نے ہمیں اپنی موجودہ، قانع، شکست رو، تماشائی کی زندگی سے بیزاری

سکھائی ہے، اس نے اس قحط سالی کا عکس پیش کیا ہے، جو عشق کو بھی بھلا دے، اس نے ادب میں عوام اور جمہور کے دل میں دھڑکن پیدا کی ہے، یہ اگرچہ بہت کچھ مغرب کی خوشہ چینی کرتی ہے مگر بحیثیتِ مجموعی مغرب سے ہم ابھی بہت کچھ لے سکتے ہیں، اس نے سینکڑوں بے زبان لوگوں کو بولنا اور لکھنا سکھایا ہے۔ اس نے گھر گھر ادیب اور شاعر پیدا کر دیے ہیں۔ اس نے اپنے طور پر اُردو ادب کو پھیلانے میں حصّہ لیا ہے، اس نے ایک جذبے، جوش اور تصوّر کی وحدت سے مدد دے کر شاعری، افسانہ نگاری اور تنقید کی دنیا میں بہت کچھ اضافے کیے ہیں مگر انصاف کا تقاضا ہے کہ اس تحریک کے بعض علم برداروں میں بڑی سطحیت، بڑی رعونت، بڑی تنگ نظری، بڑی قطعیت ہے۔ یہ زندگی کو سیاسی فارمولوں اور اقتصادی اُصولوں کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔ یہ اب سے دس سال پہلے جو کچھ لکھا گیا ہے اسے حرفِ غلط کی طرح مٹانا چاہتے ہیں اور یہ ایک اچھے ادیب کے منصب کے خلاف ہے۔ یہ ایک ذہنی غلامی سے نکال کر دوسری ذہنی غلامی میں انسان کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں، یہ فن سے ناواقفیت کو آرٹ سمجھتے ہیں اور طوائف کو ہیروئن، یہ مذہب، اخلاق اور تہذیب کو آثارِ قدیمہ کہتے ہیں اور مارکس کو انسانیت کا "حرفِ آخر"۔

ہر تحریک اپنے پیرووں سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس تحریک کو چلانے والوں میں مبلغ، نقیب، نعرہ لگانے والے، بہت ہیں۔ ایسے لوگ کم ہیں جو پروپیگنڈے اور آرٹ کے فرق کو جانتے ہوں۔ یہ چیز ایک مثال سے واضح ہو جائے گی۔

اقبال کے بعد ہماری جدید شاعری میں لوگ جوش کا نام لیتے ہیں۔ وہ فطرت کے عاشق ہیں مگر فطرت کا کام اُن کے محبوب کے لیے پھولوں کی سیج تیار کرنا ہے۔ اُن کی نظموں میں صبح، شام، برسات اور چاندنی رات، مےکدے کی رات،

اور گلستاں کی صبح کی بڑی دل کش تصویریں ملتی ہیں، اُن کی تشبیہات جان دار، پُرشکوہ اور حسین ہیں، مگر ان کا عشق بازاری، اُن کے جذبات شہوانی اور اُن کا فلسفۂ زندگی رندانہ اور بوالہوسانہ ہے۔ انھوں نے اپنی بیشتر نظموں کا مجموعہ ۱۹۳۵ء کے قریب مرتب کیا، اس لیے یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کب اُن کی رندی کی محفل میں انقلاب کی صدا پہنچی۔ اچانک یا تو قاضی نذر الاسلام کی نظموں کے ترجموں سے متاثر ہو کر یا اقبال کے اُن خیالات سے جو پیامِ مشرق، زبورِ عجم اور جاوید نامہ میں ملتے ہیں۔ جوش انقلاب کے ترانے گانے لگتے ہیں۔ کسان، مزدور، قلی، مہترانی، جامن والی، گرمی اور دیہاتی بازار، شباب کے نعرے اور بغاوت کے دعوے، نقش و نگار کے بعد ہر مجموعے میں مل جاتے ہیں۔ ان نظموں میں بڑا جوش اور زور ہے، یہ بڑے خلوص سے لکھی گئی ہیں۔ مگر ان میں خیال کی گہرائی ناپید ہے۔ ان میں خطابت کا دم خم زیادہ ہے۔ وہ شعریت کم ہے۔ جو اپنی ابدیت کی خاطر غم و غصے کی آندھی کے بجائے گدازِ قلب کی دھیمی آنچ کو پسند کرتی ہے۔ پھر ان کی شاعری میں اُن کی شخصیت اور زندگی کی طرح علیحدہ علیحدہ خانے ہیں۔ ابھی وہ رند ہیں اور مے کدے میں دادِ عشرت دے رہے ہیں اور ابھی کفر و ایمان کی ہڈیاں چبا ڈالنے کا عزم کر رہے ہیں۔ ابھی مشیت اور خدا کے خلاف آوازِ بلند کر رہے ہیں اور ابھی حسینؓ اور انقلاب کے عنوان پر مرثیہ لکھ رہے ہیں۔ وہ انقلاب اور رندی کو ملانا چاہتے ہیں حالاں کہ دونوں میں ایک ازلی تضاد ہے۔ رند انقلابی نہیں ہوتا، نہ انقلابی رند ہونا گوارا کر سکتا ہے۔ جوش خیالات انقلابی رکھتے ہیں اور مشرب رندانہ۔

جوش کے اثر سے رندی، عریانی، تشبیہات کی فراوانی اور جذبات کا ایک طوفان، مذہب پر تمسخر، اخلاق سے بیزاری، موجودہ شاعری میں کافی راہ

پا گئی ہیں یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ اُن بچوں کی طرح جو ہر وقت اس ڈر کے مارے
کہ کوئی انہیں چپت نہ لگا دے، خود مار پیٹ پر آمادہ رہتے ہیں۔ اس لیے ان کی
شاعری میں جو رعونت ہے وہ ایک احساسِ کمتری کی بنا پر ہے۔ کاش یہ کم ہو جائے
تو ایک اچھا توازنِ ذہنی قائم ہو سکے۔

جنگِ عظیم کے بعد غزل بھی بدلی ہے، اس نے نظم سے بہت کچھ لیا ہے مگر وہ تین
شعرا ایسے ہیں جو زبان و مکان سے آزاد ہیں۔ فانی، اصغر، جگر کا نام اس سلسلے میں
لیا جا سکتا ہے۔ فانی کی شاعری میں جو المیہ رنگ ہے اس کی یکسانی کی وجہ سے بعض
لوگ ان کی عظمت سے انکار کر دیتے ہیں۔ انھوں نے انھی علامات و اشارات سے
آخر تک کام لیا جو اُن کے پیش رو برتتے تھے۔ غزل کے اسلوب میں اتنی تھوڑی اور
قدیم علامات کے منتشر پردوں کے باوجود فانی کی شاعری ایک ایسا حسن، ایک ایسی
جوانی اور ایک ایسی چھاپ دمک رکھتی ہے جو حیرت انگیز ہے۔ انھوں نے دکھا دیا کہ
میر کے قریب ہونے کے لیے فانی کے راستے سے بھی گزرنا ضروری ہے۔ فانی کے
اشعار میں جو مجبوری و بے چارگی، جو پامالی و خستگی ملتی ہے وہ اگرچہ فانی معلوم ہوتی ہے
مگر کون جانے اس میں اجتماعی زندگی کی کتنی محرومیاں اور ماحول کی کتنی تلخیاں ملی
ہوئی ہیں۔ اصغر کے یہاں غالب و مومن کا امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے اس دُنیا کے
حُسن کو اس دُنیا کی زبان میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے ہر جامِ آتشیں میں مہ و انجم
دیکھے اور دکھائے ہیں اور "ہر شیشہ میں کوہِ ثریا" بنا یا ہے۔ حسن کا یہ مجازی حسنِ نسوانی
کو بھی حسنِ آسمانی بنا کر پیش کرتا ہے، پروانے کی دُنیا جس کی خاکستر میں اقبال کو تعمیر
جونکے لیے چنگاریاں ملتی ہیں، اصغر کے نزدیک حسن کی دنیا ہے۔ "اس میں
شمعِ شبستاں" کے انداز سارے کے سارے خوب ہیں۔ اُن کی ایک لطیف مترنم
و رشیا دابیہ لوچ میں کچھ دہرنگ شستگی اور ہشیاری کے درمیان جھولا جھلاتی ہے مگر

اقبال سے کچھ متاثر ہونے کے باوجود ہم اُن میں اپنے دَور کی کوئی خاص علامت
نہیں پاتے اور یہ علامت ہم جگرؔ میں پاتے ہیں۔ جگر کی غزل میں جوانی کا نشہ ہے، اس
جوانی کا جو بدمست ہوتی ہے، خرد و ہوش سے بے نیاز ہوتی ہے، سرتاپا جذبہ ہوتی ہے،
شاید شراب کے لیے وقف ہوتی ہے۔ غرض اُن کے یہاں ابھی بہت دن تک وہ
شاعری ملتی ہے جو عنفوانِ شباب کی ہے اور اپنی تیزی و تندی کی وجہ سے جوانوں اور
بوڑھوں سب کو متاثر کرتی ہے مگر جب جگر ہوش میں آتے ہیں تو اُن کا وہ نفسیاتی شعور
جو اُن کی سرمستی بلکہ بدمستی میں کچھ خوابیدہ سا تھا بیدار ہو جاتا ہے اور اس کے بعد
انہوں نے وارداتِ قلبیہ کی ایسی ایسی تصویریں کھینچی ہیں کہ ان میں ہر دل کی تصویر
آگئی ہے۔ انہوں نے حسن کا محض وہ مفہوم چھوڑ دیا ہے جو سینۂ شفاف اور زلفِ
پریشاں تا کمر تک محدود تھا اور اُن کا وہ عشق بھی اب کچھ بدل سا گیا ہے جو اپنی
نارسائی کا انتقام ایک سفر و منز تفوق سے لیا کرتا تھا، بلکہ اب اُن کے یہاں
حسن و عشق وہ پراسرار گہرے اور اتھاہ سمندر ہیں جن کی تہہ سے موتی نکالنا اُن
کا محبوب مشغلہ ہے اور جن کی چمک جھنگ اور گرانی کے باوجود باقی ہے۔

ان غزل گو شعرا پر تو زمانے کا اثر زیادہ نہیں مگر دوسرے اس سے بچ
نہیں سکے ہیں۔ آرزو کو سادگی عزیز ہے تو اس وجہ سے "افسر اور حفیظ کی غزلیں،
غزلیں کا ہے کو ہیں گیت ہیں مگر ان میں میر و دورِ آخر کے غالب کی سادگی نہیں،
بیسویں صدی کی سادگی ہے جو پرکار نہ سہی تازہ کار ضرور ہے۔ اس زمانہ کا اثر فراق
کی غزلوں میں بہت کچھ نمایاں ہے۔ یہ شخص فانی کا سا المیہ احساس رکھتا ہے مگر جدید
ذہن ہر سلسلے میں جو الجھن میں جو سلسلہ دیکھتا ہے اور جو اجتماعِ ضدین پاتا ہے وہ
انہیں فانی کے رنگ سے بچا کر ایک اور وادی میں لے گیا۔ فراق ہمارے ان شعرا
میں سے ہیں جو مغربی سانچوں سے پوری طرح واقف ہیں۔ مگر اس سے اُن کی شرقیت

اور گہری ہوگئی ہے۔ ان کے خیال میں آپ کو بڑی گہرائی ملے گی، اتنی گہرائی کہ اُن کی زبان اکھڑی اکھڑی اور اُلجھی اُلجھی سی معلوم ہوتی ہے، نیاز فتح پوری کو ان کی پختگی سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ میں ان کی پختگی کا منتظر ہوں۔

نوجوان شعرا میں اگرچہ سبھی نے غزلیں کہی ہیں مگر مجھے فراقؔ کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ اگلے بیس سال زیادہ تر نظم کے سال معلوم ہوتے ہیں۔ موجودہ غزل اقبال کے اثر سے زیادہ عالمانہ ہوگئی ہے۔ عالمانہ سنجیدگی اور شاعرانہ شگفتگی کا توازن یوں ہی بہت مشکل ہے۔ چہ جائیکہ غزل میں، عالمانہ پختگی سے ہٹ کر یہ گیت کی طرح ہلکی پھلکی اور سیدھی سادی اور بے تکلف ہوگئی ہے اور یہ بھی اس کے لیے ایک خطرہ ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ نوجوانوں میں جن کی عمر ۲۵ اور ۳۰ کے درمیان ہے صرف جذبی ایسے معلوم ہوتے ہیں جو اچھے غزل گو کہے جا سکتے ہیں مگر یہ شاید اس وجہ سے کہ اُن پر فانی کا خاصہ اثر ہے۔

آزاد انصاری، اثر لکھنوی اور جوش ملیح آبادی نے مسلسل غزلیں بھی بکثرت لکھی ہیں اور ان کا مقصد غزل اور نظم کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنا ہے۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں اور تمام اساتذہ کے یہاں مسلسل غزلیں اور قطعہ بند اشعار مل جاتے ہیں مگر ایک مسلسل تحریک کی حیثیت سے یہ روش زیادہ مقبول نہیں ہوئی بلکہ اقبال نے غزلوں میں نظموں کے مضامین جس خوبی سے برتے اس کا اثر ہوا اور اب نظمیہ غزلیں یا غزلیہ نظمیں کافی مل جائیں گی۔

آل احمد سرور

دنیا کی تاریخ میں بیسویں صدی کئی حیثیتوں سے ممتاز ہے۔ اس سے پہلے کوئی صدی دنیا بھر کے لیے یکساں حالات، یکساں خیالات اور یکساں مصائب نہیں پیش کرسکی۔ پوری دنیا اس صدی میں ایک واحد تمدن کی طرف حرکت کر رہی ہے۔ سیاسی اور معاشی تحریکیں اب صرف چند خاص جغرافیائی خطوں تک محدود نہیں رہیں، ان کا اثر کم و بیش دنیا بھر میں محسوس ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک کا ادب دوسرے ممالک کے ادب سے اور ان کے تمدن سے متاثر ہو رہا ہے ساتھ ہی ساتھ ردِ عمل کی کوشش اور تحریکیں بھی جاری ہیں۔ ہر ملک ایک طرف تو دنیا کے دوسرے ممالک کی ادبی شاہکاروں سے متاثر ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے ماضی کے خزانے پھر سے ڈھونڈ رہا ہے۔

بیسویں صدی کی اردو شاعری بھی اس صدی کی دنیا بھر کی شاعری کا ایک ایسا جز ہے جو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ خیالات، تصورات، تشبیہات سب میں وہ خصوصیتیں پیدا ہو گئی ہیں جو دوسرے ممالک کی اس صدی کی شاعری میں موجود ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کی تحریکیں ہندوستان میں مردہ ہو کر پہنچتی ہیں پھر بھی بعض اعلیٰ دماغ اور بلند خیال اردو شاعروں کے شاہکار اس صدی کی دنیا بھر کی بہترین نظموں میں گنے جا سکتے ہیں۔ اس مجموعے کا معیار میں نے یہی قرار دیا کہ صرف ایسی نظمیں شامل کی جائیں جو کسی نہ کسی طرح بیسویں صدی کے

خیالات کا مظہر ہوں (زبان کا ردِ عمل پیش کریں) اور نظموں کا یہ معیار ہو کہ اگر کسی غیر زبان میں ترجمہ کی جائیں، تب بھی زبان سے قطع نظر، ایک خاص چیز ہوں۔

غدر ۱۸۵۷ء کی شکست، ایک حد تک ہندستانی (قرونِ وسطیٰ کے) تمدن کی شکست تھی، جس طرح ہندستانیوں نے اقتصادی اور سیاسی ضروریات کے تحت انگریزی سیکھنا اور بڑی حد تک مغربی تمدن کی خاص خاص چیزوں کو اختیار کرنا ناگزیر سمجھا۔ اسی طرح اُردو ادب اور شاعری نے بھی اسی طرح کی تبدیلی کی ضرورت سمجھی۔ معاشی حالات کا اثر معاشرت پر اور معاشرت کا اثر ذوقِ فنون پر پڑنا ہی تھا۔ چنانچہ محمد حسین آزاد کی نیم پختہ و نیم خام اور حالی کی پختہ تر کوششوں نے اردو شاعری کا رُخ بالکل بدل دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری کے رسومِ کہن کچھ شکلوں میں باقی رہے۔ بہت سے شاعروں نے غزل کی ڈگر نہیں چھوڑی، اور اب بھی ایسے غزل گو شعرا موجود ہیں جو میر اور آتش، امیر اور داغ کے پرانے اسلوبوں کو نباہ رہے ہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ امیر و داغ کے جانشینوں کا جو قدم اُٹھتا ہے وہ تنزل کی طرف اٹھتا ہے۔ اس قسم کی تنزل پذیر شاعری ہمیشہ کمزور ہوتی جاتی ہے اور قدرتی موت مرتی ہے۔

جہاں تک صحتِ خیالات اور ذہنی جذبات کا تعلق ہے غزل کی جو اصلاح غالب اور ان کے بعد حالی نے کی تھی، اس کا بھی سلسلہ جاری رہا۔ بالِ جبریل اور ضربِ کلیم میں اقبال کی غزلیں اسی قسم کی ہیں۔ ان جدید طرح کی غزلوں پر مغرب کے اسالیب اور خیال نے اثر ڈالا اور اس کے ساتھ مشرق کی والہانہ رسمِ اُلفت اور متصوفانہ مشرب نے مل کر ایک خاص رنگ اختیار کیا۔ اس رنگ میں چند شاعروں (شاد، حسرت، جگر، فانی، اصغر وغیرہ) نے فلسفیانہ مضامین بھی باندھے۔ اگرچہ فلسفیانہ اشعار کا موضوع زیادہ تر فلسفۂ غم اور بے ثباتیِ دنیا ہے ہندستان اور خصوصیت سے

ہندستانی مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی حالت اس رنگ کی شاعری کی ذمہ دار ہے مفلسی کا ناکام عشق، بیماریاں، دبائیں اور موت، عزیزوں کی موت کا اثر خاندان کی معاشی حالت پر یہ وہ چھپی ہوئی طاقتیں ہیں جو اردو کی پرانی رسمِ شاعری کی مدد سے، جدید خیالات کی چاشنی کے ساتھ "جدید غزلوں" میں نظر آتی ہیں۔ اقبال کی غزلیں (گو شاعری کے نقطۂ نظر سے کم رتبہ) خیالات کی حد تک اُن سے مختلف ہیں۔ جس کی وجہ غالباً اقبال کی صاف بیانی ہے۔ جب سامیت اٹھائی تو اقبال نے اپنے قصر پر کھلم کھلا فخر کیا۔ اور خود ہوئے ہوں یا نہ ہوں مگر ان کی شاعری اس طرح کے عشق میں کبھی نہیں گرفتار ہوئی جو رودکی سمرقندی کے زمانے سے لے کر فانی اور حسرت کے دور تک ٹرکی اور ایران اور مسلمان ہندستان کی شاعری اور ادب پر حکومت کرتا رہا۔

ادب میں، فنونِ لطیفہ میں، اور سب سے زیادہ شاعری میں گزشتہ دو تین سو سال کے عرصے میں ساری دُنیا کی رہنمائی یورپ نے کی ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں پہلے تو سیاسی۔ یورپ ساری دنیا پر پھیل چکا ہے اور دُنیا کے دُور دراز اور کم معلوم ترین گوشے مغربی تمدن سے اچھی طرح آشنا ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ سیاسی وجہ صرف یورپی اثرات کی اشاعت میں مدد دیتی ہے۔ یورپ کی شاعری کی مقبولیت کا باعث ایک اور چیز ہے جس کو اگر قوتِ حیات (VITALITY) کہا جائے تو بجا ہوگا۔ یہ ڈائنامیٹ کی سی طاقت جس میں تعمیر اور تخریب دونوں خصوصیتیں موجود لیکن جس کا مقصد زندہ رہنا اور اپنے آپ کو زندہ محسوس کرنا ہے، یورپ کے تمدن کی خصوصیتِ عالیہ ہے۔ اسی نے جدید سائنس کی بنیاد ڈالی، اسی نے فلسفہ کا رُخ نظریات سے بدل کر تجربات کی طرف کر دیا، اسی نے تاریخ کی نئی تحقیق شروع کی اسی نے نفسیات اور نفسیاتِ تحلیلی کا پتا چلایا، اسی نے ستاروں کی گردش کے

راز دریافت کیے، اسی نے زمین کی کشش محسوس کی، اسی نے پہلی مرتبہ بے خوف و خطر مذہب اور پرانی روایات کے خلاف زبان کھولی (اگرچہ اس سے پہلے بھی لوگوں نے ڈرتے ڈرتے ڈرتے شک کرنے کی کوشش کی تھی) اسی نے سیاست اور معاشیات کے اصول مرتب کیے۔ اور ایک نئی طرح کی شہنشاہیت۔ تجارتی شہنشاہیت سے ساری دنیا پر حکومت کی۔ اسی نے سرمایہ داری کی بنیاد ڈالی اور پھر اس کی تلخی محسوس کرکے اُسے جڑ بنیاد سے اُکھیڑ ڈالنا چاہا۔ یہ قوتِ حیات مختلف پیرایوں میں مختلف قوموں کو ملی لیکن اہلِ یورپ اس لحاظ سے خوش قسمت رہے کہ اُنھوں نے اسے سب سے زیادہ استعمال کیا۔ یہی قوتِ حیات اُن کے ادب، اُن کے فنون اور اُن کی شاعری کی جان ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یورپ کا ہر ملک اِس قوت کا کا تماشا ایک نئے زاویے سے دکھاتا ہے۔ صرف فنونِ لطیفہ کو لیجیے۔ انگلستان، جرمنی، فرانس اور اطالیہ کی موجودہ شاعری (با وجود باہمی اثرات اور مشترک تحریکات کے) بالکل جُدا جُدا طور پر زندگی کی قوتوں، زندہ جذبات، اور دماغی اور ذہنی اثرات کو پیش کرتی ہے۔

انیسویں صدی کے اُردو شاعروں میں سے جن جن نے جدید طرز پیدا کرنے کی کوشش کی، صرف انگریزی شاعری کی (جس کو وہ غالباً اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے تھے کیوں کہ اس کے ماحول سے ناواقف تھے) پیروی کی۔ بیسویں صدی میں یہ بات نہیں رہی، بہت سے شعرا انگریزی کے علاوہ دوسری زبانیں بھی جانتے تھے۔ مثلاً اقبال اور عبدالرحمان بجنوری وغیرہ جو نہیں بھی جانتے تھے انھوں نے دوسری زبانوں کے شاہ کاروں کے انگریزی ترجمے پڑھے۔ نقطۂ نظر وسیع ہوتا گیا۔ خصوصاً جنگِ عظیم کے زمانے میں جو ذہنی احساس پستی انگریزی شوکت (اور اس لحاظ سے اُن کے ادب) کے مقابل محسوس ہوتا تھا وہ اس طرح کم

ہونے لگا کہ یورپ کی دوسری قوموں کی عظمت اور تمدنِ جدید کی تشکیل میں ان کا حصہ بھی سمجھ میں آنے لگا۔ اپنے ماضی کی عظمت کے افسانے جو حالی نے دہرائے تھے اقبال کی آواز میں کبھی نعرۂ جنگ بن گئے اور کبھی ترانہ۔ اس طرح جدید اثرات کی بے بصر تقلید نہیں کی گئی اور نہ ان کی غلط اشاعت ہوئی۔ یہ تحریکیں جب ہندوستان پہنچیں تو انھیں ہندوستانی رنگ میں رنگا گیا۔ جہاں انھوں نے مشرق کے آدابِ قدیمہ سے پرخاش کی کوشش کی تو کبھی ان کا مذاق اڑایا گیا۔ (اکبر) کبھی صحیح یا غلط فلسفیانہ استدلال سے ان کو غلط قرار دیا گیا (اقبال) ان کوششوں سے ایک فائدہ تو ہوا اُردو شاعری میں استدلال، فلسفیانہ مباحث، ذہنی سرگرمی کے راستے کھل گئے۔ جب انگلستان کے سوا دوسرے ملکوں کے اثرات قبول کرنے کو ہماری شاعری تیار ہو گئی تو یہ اثرات صرف یورپ تک محدود نہیں رہے۔ جاپانی نظموں کے ترجموں سے اخذ کر کے بجنوری مرحوم نے دو تین نظمیں لکھیں۔ جن شعرا میں صلاحیت تھی، اور انھیں مواقع حاصل تھے، انھوں نے اپنی نظموں میں پرانی ہندی کی چاشنی دے کر عجب طرح کا رنگ پیدا کیا، اور ان نظموں سے بعض اُردو میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ مثلاً عظمت اللہ خاں مرحوم کی نظمیں، ہاشمی صاحب کی "کالی ناگن" بجنوری مرحوم کی "صبح بنارس"۔ ایران اور اسلامی ممالک کی شاعری سے عشقیہ جذبات اور پامال ترکیبیں اور تشبیہیں مستعار لینے کے بجائے اقبال نے فارسی شاعری کی استعدادِ ذہنی و دماغی سے خوشہ چینی کی۔ مشرق کی ثقہ سنجیدہ شاعری اور مغربی خیالات کے سنگم پر ایسی نظمیں نمودار ہوئیں جن پر اس صدی کی اُردو شاعری بجا طور پر فخر کر سکتی ہے جیسے اقبال کی اکثر نظمیں، ہاشمی کی "سراغ صبح" وغیرہ، شاد عظیم آبادی کا مستزاد "کچھ کہہ نہیں سکتا"

آرٹ کے تصورات جب پہلے پہل اُردو ادب کے سامنے آئے تو ان کا اثر

بھی ایک طرح کا معمہ بن گیا۔ بہر حال شاعری پر آرٹ کے اثر کے دو نتیجے ہو سکتے تھے۔ ایک تو یہ کہ ایسی نظمیں لکھی جائیں جن میں دوسرے فنونِ لطیفہ کے شاہکار وں یا حسنِ نسوانی (سراپا کی ایک جدید اور بدلی ہوئی شکل) کی تصویر کھینچی جائیں۔ دوسری یہ کہ ایسی نظمیں لکھی جائیں جو آرٹ کا مکمل نمونہ ہوں۔ ان تحریکوں کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی جتنی مقبولیت آج کل مکتب شاماکاتات کو حیدر آباد میں حاصل ہے۔ ان دونوں تحریکوں سے اردو شاعری کو باقاعدہ طور پر روشناس کرانے کا سہرا بجنوری مرحوم کے سر ہے۔ "نٹ راجا" جو شیوجی کے رقص تخریب پر لکھی گئی ہے اپنے ناموس اور دقیق الفاظ کے ہجوم معنی سے اور اپنی بحر کے ذریعے جو پہلے پھیلتی ہے پھر دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں سمٹ جاتی ہے اور پھر پھیلتی ہے، رقص کے اس مجسمہ سنگ کی بیک وقت ناقابل فہم اور ٹھوس اور پھر متحرک و متلاطم کیفیات کی سرگزشت، شاعری کے ذریعے دہراتی ہے۔ بجنوری مرحوم کی "ناہید" اگرچہ غراقی بحر میں لکھی گئی لیکن اس کا موضوع غالباً شکستہ دست زہرہ VENUS DE MILO ہے۔ یہ نظم اس کوشش کی ناکامیابی کی دلیل ہے جو ایک فنِ لطیف کے شاہکار کو دوسرے فن کے ذریعے دہرانے میں کی جاتی ہے۔ شاعری سنگ تراشی کا کام نہیں کر سکتی۔ سنگ تراشی مصوری کی خصوصیات نہیں پیدا کر سکتی۔ بجنوری نے اس نظم میں میکائیل آنجلو کے اس خیال کو ادا کرنا چاہا ہے کہ "مجسمہ پتھر کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے۔ سنگ تراش کی نظر اور اس کا اوزار صرف اس کی نقاب کو توڑ دیتا ہے۔" اس خیال کو انھوں نے پوری نظم میں ادا کرنا چاہا ہے لیکن چوں کہ ایک ہی سطر میں اصلی خیال ادا ہو گیا۔ اس لیے باقی حصہ محض حاشیہ بن کر رہ گیا ہے وہ ایک شعر یہ ہے ؎

سنگ میں سو رہی تھی وہ جیسے شکم میں طفل ہو
سن کے صدائے تیشہ کو خواب گراں محال تھا

اس کے بعد کا یعنی نظم کا آخری شعر ؎

روح تصویرِ نہاں، جسم تھا صورتِ عیاں
حسنِ حیاتِ جاوداں ان کا باہم وصال تھا

پوری نظم کی تغلیط کرتا ہے کیوں کہ مائیکل اینجلو کے ساتھ بجنوری مرحوم بھی تصویرِ نہاں کو جسم قرار دے چکے تھے جو پتھر ہی میں پوشیدہ رہتا ہے۔ تصویر اور صورت اس طرح ایک ہو جاتے ہیں اور عیاں اور نہاں کا فرق باقی نہیں رہتا۔ دوسرا مصرع بالکل مہمل ہو جاتا ہے۔

فنونِ لطیفہ کے ایک شاہکار (مسجدِ قرطبہ) پر سب سے کامیاب نظم اس صدی میں نہ صرف اردو شاعری میں بلکہ بہت سی زبانوں کی جدید نظمیں مجھے پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے ان سب میں، اقبال نے لکھی ہے۔ وقت کو روز و شب یعنی نور و ظلمت کے ایک گزرتے ہوئے سلسلے سے تشبیہ دی ہے۔ وقت ہر چیز کو ہر فن کو ہر موضوع کو مٹا دیتا ہے لیکن ؎

ہے مگر اس نقش کو رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

اس کی وجہ یہ ہے کہ مردِ خدا کا "عمل" "عشق سے صاحبِ فروغ" ہے عشق، اعلیٰ ترین معنوں میں ہر فن کی، ہر آرٹ کی، ہر صنعت کی اصل ہے۔ عشق جس قدر پختہ، جس قدر بلند ہوگا اسی قدر وہ مصنوعہ بھی پر شوکت ہوگا۔ جامع قرطبہ کی بہت سی مسجدیں، یورپ کے عظیم الشان کلیسا، ہندوستان کے لاثانی مندر اس کے گواہ ہیں۔ اگر عشق لازوال ہو تو پھر مصنوعہ بھی لازوال ہوگا۔ یہاں نظم بحث کا ایک اور درجہ طے کر کے اس نتیجے پر پہنچی ہے۔

اے حرمِ قرطبہ، عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز

تجھ سے دلوں کا حضور، مجھ سے دلوں کی کشود

آرٹ کا وہ شاہکار بھی لازوال ہے جس کی بنیاد لازوال عشق پر ہے، کیوں کہ اس کو دیکھ کر یہی جذبۂ عشق اس شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے جس کا اس شاہکار سے کوئی ذہنی یا جذباتی تعلق ہے "دلوں کا حضور" پیدا کر کے مسجد لازوال ہو گئی ہے، کوئی زلزلہ اُسے مٹا نہیں سکتا۔ دلوں میں وہ ایک جذبہ پیدا کر دیتی ہے اور اس جذبے کی طرح خود بھی لافانی ہو جاتی ہے۔ یہ وہی جذبہ ہے جو پھر اُسی عشق اور اس عشق سے گرماتے ہوئے نشاۃ ثانیہ کے لیے دلوں کو گرماتا ہے۔

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی

دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

فنونِ لطیفہ کا دوسرا اثر اردو شاعری پر یہ ہوا ہے کہ چھوٹی چھوٹی نظموں میں وہ تناسب، رنگ یا ایسی اور خصوصیتیں پیدا کی گئی ہیں جو دوسرے فنونِ لطیفہ میں پائی جاتی ہیں۔ بجنوری مرحوم کی نظم "اجنبی" اس کا ایک نمونہ ہے۔ اسی طرح کی ایک نظم جوش ملیح آبادی کی "کوہستانِ دکن کی عورت" ہے۔

ساتھ ہی ساتھ ایسی نظمیں بھی لکھی گئی ہیں جو بجائے خود شاعرانہ آرٹ کا مکمل نمونہ بننے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان نظموں میں تفصیل و صراحت کی گنجائش نہیں ہوتی۔ تشبیہیں یا تو استعمال ہی کم کی جاتی ہیں یا بیان کا کام دیتی ہیں۔ اس مجموعے میں اس نوع کی بہترین مثال غالباً بجنوری مرحوم کی نظم "صبح بنارس" (جوگی کی صدا) ہے۔ جوش کا "بدلی کا چاند" کچھ اسی طرزِ ادا کی ضیا باری کرتا ہے۔ بجنوری مرحوم کی وفات پر ہاشمی فرید آبادی نے جو نظم لکھی ہے یہی خصوصیت اس میں بھی پائی جاتی ہے۔ سجاد حیدر یلدرم نے "شملہ کالکا ریلوے پر ایک نظارہ" دیکھ کر اس کو اسی طرح

ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ اس طرح کی نظمیں جو ختم صدی (FIN DE SIECLE) پر فرانس اور انگلستان میں مقبول تھیں، اور پھر ان کی مقبولیت دنیا بھر میں پھیلنے لگی۔ آمد سے زیادہ آورد کا نتیجہ ہیں۔ نہیں بلکہ اصل میں اُن کا بنیادی جذبہ قدرتی ہوتا ہے۔ آمد ان کی بنیاد ہوتی ہے مگر شعر کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے صناعانہ صلاحیت اور صناعانہ استعداد کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔

ہندستانی اثرات، سیاسی اثرات سے وابستہ ہیں۔ جذبات کی حد تک یہ تین قسم کے ہیں:۔ (۱) آزادی کے جذبات۔ ان کی شاعری کبھی صاف صاف اور کبھی کھُلّم کھلا سامراج کے خلاف ہے۔ اقبال کی شاعری میں وہ فلسفیانہ رنگ اختیار کرتی ہے اور عمل کی دعوت دیتی ہے۔ جوش کی شاعری محض جوش دکھاتی ہے، اور بعض ایسے شعرا کی شاعری میں جو شاعر سے زیادہ سیاسی تھے اور جنھوں نے اس راہ میں بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں، پردوں میں چھپ کے اپنا جلوہ دکھلاتی ہے۔ ان کے کلام میں عشق (قدیم مشرقی) اور آزادی تقریباً ہم معنی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً حسرت موہانی یا مولانا محمد علی کا کلام ؎

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد   ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

سیاسی شاعری کی دوسری قسم :۔ (۲) ہندو مسلم یکجہتی کی شاعری ہے جس کا نمایاں ترین رہنما مینارہ "نیا شوالہ" ہے۔ یہ مینار اس قدر خوش نما تھا کہ اقبال خود اس کو منہدم نہ کر سکے۔ قومی شاعری ان دو انواع پر مشتمل ہے۔ وہ ہندستان میں اتحاد کی تلقین کرتی ہے اور آزادی کی دعوت دیتی ہے۔ چکبست نے ایسی شاعری بہت کی مگر ان کی اس قسم کی نظموں میں شاید کوئی ہو جو بہت بلند معیار کی ہو۔ (۳) تیسری قسم اسلامی یا ملی شاعری ہے جس کے قائد اعظم اقبال تھے اور ان کی

اس طرح کی شاعری پر اور خود ان پر اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ یہاں کچھ اور لکھنا باعث طوالت ہوگا۔

قومی شاعری اور قومی تحریکات کا اثر یہ بھی ہوا کہ ہندستانی موضوعات پر ہندستان کی چاشنی کے ساتھ نظمیں لکھی گئیں۔ سرور جہان آبادی کی نظم "گلشنِ جی" میں زبان کی چاشنی کے ساتھ مذہبی عقیدت کا حسن ہے۔ عظمت اللہ خاں مرحوم کی ہندی آمیز شاعری نے اردو میں خاص شہرت اور قبولیت حاصل کی ہے۔ اور بعض نظمیں بہت خوب ہیں۔ "مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا" مجموعی طور پر بہت کامیاب نظم ہے۔ جذبات، ماحول، درد و اثر، زبان، اسلوب سب کا ہندستان کے ماحول سے تعلق ہے۔ "پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی" میں موضوع کی طرح گنگا بھی لطف ہے۔ "ترک" اور "ہنڈولے" میں کی خصوصیات نظم کے اسلوب میں بھی ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ اس طرح کی نظموں میں ہاشمی فرید آبادی کی "کالی ناگن" بہت دل چسپ ہے۔ ناگن قدیم آریائی (ہندستانی اور یونانی) افسانوں کی ناگن کی طرح عورت بھی ہے اور سانپ بھی یہ ناگن یورپ کے انیسویں صدی کے رومانوی ادب میں بار بار نظر آتی ہے کیٹس کی لامیا (LAMIA) اسی شاعر اور یورپ کے عام رومانی ادب کی محبوبہ طناز و بے رحم LA BELLE DAME SANS MERCI کی رشتے کی بہن ہے۔ اسی طرح ہاشمی صاحب کی ناگن بوقتِ واحد ناگن بھی ہے اور عورت بھی۔

آیا ہے وہ آہنگ جوانی کی اور بات پہیلی ترنگا ہے

یا سوچ کے پیچھے پانی کی اور اس کی گیلی پھرتی ہے

کچھ شرم ہے کچھ خود آرائی ہے نشے کی انگڑائی

ہر بات انیلی کھلتی ہے اٹھ اٹھ متوالی گرتی ہے

میں اس تمہید کی ابتدا میں لکھ چکا ہوں کہ اس صدی میں دنیا سمٹ کر

الجھا ہوا تمدن، علوم و فنون، ہر چیز ایک ہوتی جا رہی ہے اس لیے اُردو شاعری کو اس صدی کی دُنیا بھر کی شاعری کا ایک جزو شامل سمجھنا چاہیے لیکن اس پر بھی جہاں تک زبان، زبان کے سانچوں، ترکیبوں، تشبیہوں، استعاروں، خیالات، جذبات، محاورات کا تعلق ہے، ماضی اور حال کے درمیان موہوم سا خطِ فاصل بھی کھینچنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ ہر دور میں، ہر زبان کے ادب میں دو گونہ عمل ہوتا رہتا ہے۔ باہر سے تحریکیں آتی ہیں اور زبان و ادب کا جزو بنتی جاتی ہیں، اسی طرح اس زبان اور ادب کے رسوم و روایات میں بھی ارتقا ہوتا جاتا ہے۔ کبھی محسوس، کبھی نیم محسوس، کبھی نامحسوس طور پر پرانی روایات جدید سے جدید نظم میں برابر گھر کر لیتی ہیں۔ بعض بعض شاعروں کے کلام میں یہ روایات ———— اگر ان کا تعلق ملک سے اور اہلِ ملک یا کسی فرد کے سچے جذبات سے ہو تو ———— بیرونی اثرات کا مقابلہ کرتی ہیں۔ اس مجموعے میں اس قسم کا بہترین نمونہ شوق کی "عالمِ خیال" کا انتخاب ہے۔ اس نظم میں اگر کوئی چیز جدید ہے تو اس کی حقیقت نگاری، جس میں ایک ہندوستانی عورت کے سچے جذبات کا تجزیہ اُردو شاعری میں بے مثل ہے۔ شوق کی صناعانہ صلاحیت کی تعمیر میں مغربی ادب کے اثرات کا ضرور ہاتھ تھا۔ "قاسم و زہرہ"، "رومیو اور جولیٹ" کا چربہ ہے۔ لیکن جب نقل سے گزر کر انھوں نے حقیقت کو ادا کیا تو اُن کی شاعری کچھ سے کچھ ہو گئی۔

دو طویل نظمیں اس صدی کی اُردو شاعری کے لیے باعثِ فخر ہیں۔ ان میں سے ایک "جوگی اور ناظر" بہت مشہور ہے۔ منظر کشی، الفاظ، نیم مصرعوں اور مصرعوں کی مناسبت اور ان کے باہمی جوڑ، ترکیبوں اور تشبیہوں اور ذہنی رنگ میں مادی اور روحانی زندگیوں کے باہم فرق کا رنج ———— یہ سب چیزیں اس نادر اور بے عجیب طور پر اس نظم میں جمع ہو گئیں ہیں کہ یہ

ایک نظم اپنے شاعر کا نام ہمیشہ اُردو میں زندہ رکھے گی۔ دوسری نظم گرے کے مشہور نوحے کا آزاد ترجمہ ہے۔ جو طباطبائی مرحوم نے کیا ہے۔ ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ مغربی تشبیہوں کی جگہ مشرقی تشبیہیں، مغربی روایاتِ شاعرانہ کی جگہ مشرقی روایاتِ شاعرانہ اس خوبی سے استعمال کی گئی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ہر بند کا ترجمہ اس قدر صحیح اور جامع طور پر ہوا ہے کہ جہاں تک ترجمے کا تعلق ہے، اس سے بہتر ہو سکتا ناممکن تھا۔

عزیز احمد

حیدرآباد۔ ۷ راگست ۱۹۴۰ء

سر محمد اقبال

شمع

بزمِ جہاں میں مَیں بھی ہوں اى شمع دردمند   فریاد در گرہ صفتِ دانۂ سپند

دی عشق نے حرارتِ سوزِ دروں تجھے   اور گُل فروشِ اشکِ شفق گوں کیا مجھے

ہو شمعِ بزمِ عیش کہ شمعِ مزار تو

ہر حال اشکِ غم سے رہی ہم کنار تو

یک بیں تری نظر صفتِ عاشقانِ راز   میری نگاہ مایۂ آشوبِ امتیاز

کعبے میں بتکدے میں ہے یکساں تری ضیا   مَیں امتیازِ دیر و حرم میں پھنسا ہوا

ہے شانِ آہ کی ترے دودِ سیاہ میں

پوشیدہ کوئی دل ہے تری جلوہ گاہ میں

جلتی ہے تو کہ برقِ تجلّی سے دُور ہے   بیدرد تیرے سوز کو سمجھے کہ نور ہے

تو جل رہی ہے اور تجھے کچھ خبر نہیں   بینا ہے اور سوزِ دروں پر نظر نہیں

مَیں جوشِ اضطراب سے سیماب وار بھی   آگاہِ اضطرابِ دلِ بے قرار بھی

تھا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا

احساس دے دیا مجھے اپنے گداز کا

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار   خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار

یہ امتیازِ رفعت و پستی اسی سے ہے   گُل میں مہک شراب میں مستی اسی سے ہے

بستان و بلبل و گُل و بو ہے یہ آگہی

اصلِ کشاکشِ من و تو ہے یہ آگہی

صبحِ ازل جو حسن ہوا دلستانِ عشق
آوازِ کن ہوئی تپش آموزِ جانِ عشق

یہ حکم تھا کہ گلشنِ کن کی بہار دیکھ
اک آنکھ لے کے خوابِ پریشاں ہزار دیکھ

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجابِ وجود کی
شامِ فراقِ صبح تھی میری نمود کی

وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا
زیبِ درختِ طور مرا آشیانہ تھا

قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں
غربت کے غم کدے کو وطن جانتا ہوں میں

یادِ وطن فسردگیٔ بے سبب بنی
شوقِ نظر کبھی کبھی ذوقِ طلب بنی

اے شمع انتہائے فریبِ خیال دیکھ
مسجودِ ساکنانِ فلک کا مآل دیکھ

مضمون فراق کا ہوں، ثریا نشاں ہوں میں
آہنگِ طبعِ ناظمِ کون و مکاں ہوں میں

باندھا مجھے جو اس نے تو چاہی مری نمود
تحریر کر دیا سرِ دیوانِ ہست و بود

گوہر کو مشتِ خاک میں رہنا پسند ہے
بندش اگرچہ سست ہے مضمون بلند ہے

چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے
عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے

یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے
طوقِ گلوئے حسنِ تماشا پسند ہے

منزل کا اشتیاق ہے گم کردہ راہ ہوں
اے شمع میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں

صیاد آپ، حلقۂ دامِ ستم بھی آپ
بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ

میں حسن ہوں کہ عشقِ سراپا گداز ہوں
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

ہاں آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

انتخاب از خضرِ راہ

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم رواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوّتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

زندگی کی قوّتِ پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

نغمۂ بیداریٔ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آور اسکندر و جم کب تلک

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

از طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے مشرب نابے
دل گرمے نگاہِ پاک بینے جان بیتابے

تو رازِ کن فکاں ہی اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا

ہوس نے کر دیا ہی ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوّت کا بیاں ہو جا، محبّت کی زباں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہی
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیلِ تندرو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ترے علم و محبت کی نہیں ہی انتہا کوئی
نہیں ہی تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

حقیقتِ منتظر

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو تو نوا ہے محرم گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوت پردۂ ساز میں

دم طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ "اثر کہن"
نہ تری حکایت سوز میں نہ مری حدیث گداز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہی زلف ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہی صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

غزل

نالہ ہی بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی — اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی
پختہ ہوتی ہی اگر مصلحت اندیش ہو عقل — عشق ہو مصلحت اندیش تو ہی خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہی محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل — عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی
عذرِ پرہیز پہ کہتا ہی بگڑ کر ساقی — ہی ترے دل میں وہی کاوشِ انجام ابھی
ابرِ نیساں یہ تنک بخشیِ شبنم کب تک — میرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی
بادہ گردانِ عجم وہ، عربی میری شراب — میرے ساغر سے جھجکتے ہیں مے آشام ابھی

خبر اقبال کی لائی ہی گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہی تہِ دام ابھی

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

گرچہ ہے میری جستجو، دیر و حرم کی نقش بند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں

گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

نومید نہ ہو ان سے اے رہبر فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دم بدم

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

انتخاب از مسجد قرطبہ

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات — سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات

سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں — جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات

سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ — جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ — سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات

تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار — موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا — ایک زمانے کی رَو جس میں نہ دن ہے نہ رات

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر — کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات

اوّل و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام — جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ — عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو — عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفیٰ — عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک — عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود — عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

اے حرمِ قرطبہ عشق سے تیرا وجود — عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل — خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز — تجھ سے دلوں کا حضور، مجھ سے دلوں کی کشود

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب — لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پُرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت — کشتیٔ دل کے لیے سیل ہے عہدِ شباب
آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
پردہ اٹھا دوں اگر عالمِ افکار سے — لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی — روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم — کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

فرمانِ خدا

فرشتوں سے

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

عشق را بسجودِ صنماں رابطوا سفے   بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے

میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

انتخاب از ذوق و شوق

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں

چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

گرد سے پاک ہے ہوا، برگِ نخیل دھل گئے

ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں

حسنِ ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردۂ وجود

دل کے لیے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں

سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب

کوہِ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں

آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب ادھر

کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی

اہلِ فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب   گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ   ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود   فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام — میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے — عقل غیاب و جستجو! عشق حضور و اضطراب

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

جبریل اور ابلیس

جبریل

"ہمدمِ دیرینہ کیسا ہے جہانِ رنگ و بو؟"

ابلیس

"سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو!"

جبریل

"ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری جستجو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو؟"

ابلیس

"آہ ای جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو!
اب یہاں میری گزر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کو
جس کو نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لا تقنطوا؟

جبریل

"کھو دیے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو!"

ابلیس

"ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے تھپیڑے کھا رہا ہے، میں کہ تو
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو

فنونِ لطیفہ

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی صدا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

اثر صہبائی

سرگزشت

مرغزاروں میں چمن زاروں میں کہساروں میں
چرخ کے نور میں ڈوبے ہوئے نظاروں میں
شبِ تاریک کی بہکی ہوئی تنہائی میں
شبِ مہتاب کی مہکی ہوئی رعنائی میں
شفقِ شام کی رنگینی و سرشاری میں
صبحِ پُرکیف کے انوار کی بیداری میں
حُسنِ معصوم کو ہر رنگ میں دیکھا میں نے
دیدۂ شوق سے اشکوں کی روانی نہ گئی
نہ گئی دل کی تپش شعلہ فشانی نہ گئی

تیر پر تیر برستے رہے مجھ پہ برسوں
سنگ دل دور سے ہنستے رہے مجھ پر برسوں
یورشِ غم بھی سہی رنج و محن بھی دیکھے
رہِ الفت میں کئی دار و رسن بھی دیکھے
اپنے محبوب کو ہر حال میں چاہا میں نے

بزمِ امکاں میں رہا ظلمتِ باطل کا ہجوم
چھپ گئے خوف کے مارے مہ و خورشید و نجوم

ہیبتِ اہرمنی چاروں طرف طاری تھی
مردِ حق کوش پہ یہ رات بہت بھاری تھی
حق پرستوں کے لیے خنجرِ خوں خوار کہیں
زہر کا جام کہیں، نار کہیں، دار کہیں
پرچمِ حق و صداقت کو اٹھایا میں نے

تجلیات

یاد تیری شراب ہے، ذکر ترا سرود ہے
کیفِ طرب میں موجزن میرا تمام وجود ہے

اپنی ہی دھن میں عرش سے دور نکل گیا ہوں میں
اتنی بلندیوں پہ بھی مجھ کو غمِ صعود ہے

اس میں کہاں سرور و نور، آگ ہی آگ ہے ہوس
مثلِ سموم ہر نفس آہ برنگِ دود ہے

آنکھ ہو حق شناس اگر، آتا ہے تو ہی تو نظر
ورنہ تمام کائنات بت کدۂ نمود ہے

پچھلے پہر کی چاندنی، نور میں ہے دھلی ہوئی
عرشِ بریں سے فرش پر قدسیوں کا ورود ہے

فکرِ دل و جگر نہ کر، عشق میں جان سے بھی گزر
اس میں کہیں زیاں نہیں، اس میں زیاں بھی سود ہے

غرقِ سرور و نور ہوں، جام و سبو سے دور ہوں
میرے لیے کھلا ہوا میکدۂ شہود ہے
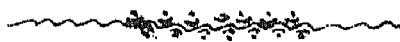
اثر لکھنوی

دلھن بنی ہوئی اب کی چمن میں آئی ہے
بہار ہو کے تری انجمن میں آئی ہے

شمیم دوست لیے پیرہن میں آئی ہے
نسیم ہوش اڑاتی چمن میں آئی ہے

ظہورِ عشق حقیقت طراز تھا ورنہ
یہ دل کشی کہیں دار و رسن میں آئی ہے

بسائی جاتی ہے اس میں قمیص یوسفؑ کی
ہوا جو مصر سے بیت الحزن میں آئی ہے

وہ بوئے خوں ہے کہ گھٹتا ہے دم معاذاللہ
بہار روادئ زخمِ کہن میں آئی ہے

یہ کس کی خاک ہے جو حسرتِ نشیمن میں
صبا کے دوش پہ صحنِ چمن میں آئی ہے

نسیم صبح کے جھونکے مہک وہ پھولوں کی
نفس نفس میں نئی روح تن میں آئی ہے

بقدرِ ذوق نہیں جوئے شیر موج افزا
ہوائے تیشہ سر کوہکن میں آئی ہے

گمان ہوتا ہے اف ری کلام کی گرمی
زبانِ شعلہ اثر کے دہن میں آئی ہے

کمر ہر قدم پر لچکتی رہی
یہ بجلی سوئے دل لپکتی رہی

ادب لاکھ تھا پھر بھی اس کی طرف
نظر میری اکثر بہکتی رہی

اگر ہونٹ سی بھی لیے کیا ہوا
نگاہوں سے الفت ٹپکتی رہی

غبارِ دلِ مضطرب چھو گیا
صبا اپنا دامن جھٹکتی رہی

نہ کھلنے پہ بھی میرے دل کی کلی
گلِ تر کی صورت مہکتی رہی

دلِ زار کی آہ بھی زار تھی
اگر آئی لب پر سسکتی رہی

اثر کی سی شیوا بیانی کہاں
بہت یوں تو بلبل چہکتی رہی

صحرا سے چلے ہیں سوئے گلشن — خونیں جگران چاک دامن
پیغام بہار دے رہی ہے — داغوں کی جھلک دلوں کی الجھن
رقصاں ہے نسیم برگ گل پر — شبنم میں ہے گھنگروؤں کی چھن چھن
غنچوں کے بدن میں سنسنی ہے — مستی میں چھوا صبا نے دامن
دل کش نہ ہو کیوں کلام آثر کا
سیکھا ہے یہ اس نے میر سے فن

دل عشق کی لو سے چمک رہا ہے — اک پھول ہے جو مہک رہا ہے
آنکھیں کب کی برس چکی ہیں — کوندا اب تک لپک رہا ہے
اب آئے بہار یا نہ آئے — آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہے

متفرق اشعار

خاکستر پروانہ میں بھی آگ دبی ہے — اے باد صبا دیکھ کے دامن کی ہوا دے

ہنگامۂ ہستی کی بس اتنی حقیقت ہے — اک موج تھی جو اٹھ کر پھر مل گئی دریا سے

افسانہ و افسوں ہے جلوؤں کی فراوانی — وہ جب نظر آتا ہے تنہا نظر آتا ہے

دل و جگر دونوں مل کے باہم مجھی کو الزام دے رہے ہیں
کہ جیسے اس کی جفا کے بدلے لٹایا ان کو میری وفا نے

بساط آرا یہاں تو ایسی کہ لحظہ لحظہ نئی ہے دنیا
مگر یہ ہستی یہ رنگ مستی کہ پا ثبات شرر نہیں ہے
اٹھی جو مینا سے موج صہبا دلوں میں ڈوبی سرور ہو کر
نظر میں ابھری تو نور ہو کر نظر کو لیکن خبر نہیں ہے

یہ نقش بنا ڈالا وہ نقش مٹا ڈالا   ہر آن سنورنے کو اک تازہ بہانہ ہے

محبت نے رگ رگ میں نشتر بھرے ہیں   ذرا دل دکھانا خبردار ہو کر

جب آشیاں کی یاد اسیری میں آگئی   اڑتے ہوئے ہوا میں شرر دیکھتے رہے

جھپکی ذرا جو آنکھ جوانی گزر گئی   بدلی کی چھانو تھی ادھر آئی ادھر گئی

کیا ہم نے چھلکتے ہوئے پیمانے نہیں دیکھا   یہ راز ہی پیمانے کا افشا نہ کریں گے

یہ اتفاق تو دیکھو بہار جب آئی   ہمارے جوش جنوں کا وہی زمانہ تھا

احسان بن دانش

گوالے

سامنے مسکرا رہی ہے سحر — اوس کی آفتاب پر ہے نظر
دھوپ کی چھوٹ ہے پڑا دے پر — گا رہے ہیں کمہار آدے پر
سوئے مغرب جو جنگلی خانہ ہے — واں سحر درد کا فسانہ ہے
ایک جھگھوٹ سا ہے گوالوں کا — گائے بکری کے دودھ والوں کا
تیز سانسوں سے بوئے مجبوری — گرم ہاتھوں پہ گردِ مزدوری
ان میں کچھ عورتیں بھی ہیں جن کے — بھوک سے ہیں سُتے ہوئے چہرے
رُخ پہ بیماری شباب کا رنگ — دیدۂ پاک میں حجاب کا زنگ
باغِ ویرانِ شادمانی کے — پھول ٹوٹے ہوئے جوانی کے
سوختاں دم بخود دا دا خاموش — ناز مجروح بانکپن بے ہوش
باری باری سے کر رہے ہیں دا — ہے جو محصول زندہ رہنے کا
جب محرر کے پاس آتے ہیں — خوف کھاتے ہیں تھرتھراتے ہیں
کاش اس پائمال طبقے کو — خستہ و پر ملال طبقے کو
رہ نما کوئی ایسا مل جائے — جو انھیں راہِ راست پر لائے

ان کے افلاس کا علاج کرے
علم سے صیقلِ مزاج کرے

جشنِ بے چارگی

ہے داغِ دل اک شامِ سیہ پوش کا منظر تھا ظلمتِ خاموش میں شہزادۂ خاور
عالم میں مچلنے ہی کو تھے رات کے گیسو انوار کے شانوں پہ تھے ظلمات کے گیسو

یہ وقت اور اک دخترِ مزدور کی رخصت
واللہ قیامت تھی قیامت تھی قیامت

نوشاہ کا جو سر پہ تھا باندھے ہوئے سہرا بھرپور جوانی میں تھا اترا ہوا چہرا
اندوہ ٹپکتا تھا بشاشت کی نظر سے مرجھائے سے رخسار تھے فاقوں کے اثر سے
کرتا بھی پرانا سا تھا پگڑی بھی پرانی مجبور تھی قسمت کے شکنجوں میں جوانی
نوشہ کے جو ساتھ آئے تھے دو چار براتی ہر اک کی جبیں سے تھی عیاں نیک صفاتی
توقیر کے، الفت کے، شرافت کے مرقعے ایثار کے، ایمان کے، غیرت کے مرقعے
ہمراہ نفیری تھی نہ باجا تھا نہ تاشا آنکھوں میں تھا بے مہری عالم کا تماشا

مجمع تھا یہ جب خستہ و افسردہ مکاں پر
تھا بھیس میں شادی کے وہاں عالمِ محشر

دالان تھا گونجا ہوا رونے کی صدا سے اک درد ٹپکتا تھا عرق ناک ہوا سے
اماں کی تھی بیٹی کی جدائی سے یہ حالت چیخوں میں ڈھلے جاتے تھے جذباتِ محبت
تھا باپ کا یہ حال کہ اندوہ کا مارا اٹھتا تھا تو دیوار کا لیتا تھا سہارا
وہ آپ کہیں اور تھا اور جان کہیں تھی سینے میں کوئی شے تھی جو قابو میں نہیں تھی
افلاس کے آرے جو جگر کاٹ رہے تھے ارمان سب اپنا ہی لہو چاٹ رہے تھے

لڑکی کا یہ عالم تھا کہ آپے کو سمیٹے
گڑیا سی بنی بیٹھی تھی چادر کو لپیٹے

تھی پاؤں میں پازیب نہ پیشانی پہ ٹیکا — اس خاکۂ افلاس کا ہر رنگ تھا پھیکا
انصاف زمانہ تھا کہ تقدیر کا چکر — ماں باپ کو آیا نہ تھا جوڑا بھی میسر
یوں کہنے کو دلھن تھی یہ مزدور کی دختر — اماں کا دوپٹہ تھا تو ابا کی تھی چادر

آخر نہ رہا باپ کو جذبات پہ قابو
تھرانے لگے ہونٹ، ٹپکنے لگے آنسو

کہنے لگا نوشہ سے کہ اے جانِ پدر سُن — اے وجہِ سکون، الفتِ جگر، نورِ نظر سُن
گو جو مری نظروں میں ہے تاریک خدائی — حاضر ہے مری عمر کی معصوم کمائی
کی لاکھ مگر ایک بھی کام آئی نہ تدبیر — مجبور ہوں مجبور یہ تقدیر ہے تقدیر
لیکن اسے ایمان کی دولت ہی بہت ہے — لڑکی کے لیے چادرِ عصمت ہی بہت ہے
اس سانولے چہرے میں تقدس کی ضیا ہے — یہ پیکرِ عفت ہے یہ فانوسِ حیا ہے
اس کے لیے چکی بھی نئی چیز نہیں ہے — بیٹی ہے مری دخترِ پرویز نہیں ہے
غربت میں یہ پیدا ہوئی غربت میں پلی ہے — خودداری و تہذیب کے سانچے میں ڈھلی ہے
زنہار یہ زیور کی تمنا نہ کرے گی — ایسا نہ کرے گی کبھی ایسا نہ کرے گی
شکوہ اسے تقدیر کا کرنا نہیں آتا — ادراک کی سرحد سے گزرنا نہیں آتا
ہے صبر کی خوگر اسے فاقوں کی ہے عادت — ماں باپ سے پائی ہے وراثت میں قناعت

اس کی بھی خوشی ہوگی تمہاری جو رضا ہو
تم اس کے لیے دوسرے درجے پہ خدا ہو

پھر آکے یہ بیٹی سے کہا نرم زباں سے — بچی مری رخصت ہے تو اب باپ سے ماں سے
امید ہے ہر بات کا احساس رہے گا — ماں باپ کی عزت کا تجھے پاس رہے گا
اے جانِ پدر حلقۂ وفاداری رہنا — آئے جو قیامت بھی تو ہنس کھیل کے سہنا

دل توڑ نہ دینا کہ خدا ساتھ ہے بیٹی

لاج اس مری ڈاڑھی کی ترے ہاتھ ہے بیٹی

آیا جو نظر مجھ کو یہ جاں کاہ نظّارہ — احساس نہ آنکھوں کو رہا ضبط کا یارا

تپنے لگی ہر سانس مری سوزِ نہاں سے — اتنا ہے مجھے یاد کہ نکلا یہ زباں سے

اے خالقِ کونین یہ تو نے بھی سنا ہے — دنیا کا گماں ہے کہ غریبوں کا خدا ہے

تو جن کا خدا ان کا ہو گردش میں ستارا — کیا تیرے کرم کو یہ ستم بھی ہے گوارا

کس طرح نہ ہو دل کو بھلا رنج و محن دیکھ — مزدور کے اس زندہ جنازے کا کفن دیکھ

احساس کبھی دل سے جدا ہو نہیں سکتا

انسان ہے انسان، خدا ہو نہیں سکتا

طوفانی نغمہ

زمانہ ہو گیا گنگا میں اک آئی تھی طغیانی — جلو میں جس کے دامن تھام کر چلتی تھی ویرانی

تھا جل تھل ایک کوسوں تک مسافر تھے نہ راہیں تھیں — یہ عالم تھا ہوا کے شام کے لب پر بھی آہیں تھیں

جو ریلا ہر گھڑی آکر ناگہاں کروٹ بدلتا تھا — بیابانوں کی پیاسی ریت کا دم سا نکلتا تھا

تھی وحشت آفریں پھنکارتی موجوں کی بیباکی — ہر ساحل پہ سہمی تھی پیراکوں کی پیراکی

درختوں سے قدم جمتے نہ تھے سیلاب آ گئے — فلک کی گردشیں سب کانپتی تھیں گرداب کے آگے

عجب بپھری ہوئی موجوں کا نقشہ تھا روانی میں — کہ جیسے ناچتی ہوں جل دیویاں قالین پانی میں

ہوائیں تیز کر دیتی تھیں جب تیور رو ریلوں کے — کنارا دم سے گر گر پاؤں چھوتا تھا تھپیڑوں کے

ہر اک ریلے میں خوفِ موت کے قدموں کی آہٹ تھی — فضائے تیرہ میں پھیلی بلا کی سنسناہٹ تھی

جدھر پانی کا رخ ہوتا تھا ساحل گرتا جاتا تھا — کسانوں کی عرق ریزی پہ پانی پھرتا جاتا تھا

بہا کر بستیاں دھارے نے کی تھی رہگزر پیدا — جو ٹکراتی تھیں دو موجیں تو ہوتے تھے شرر پیدا

یقیں ہوتا تھا اکثر جوشِ طوفاں کے قرینے سے
کہ اب مل جائے گا جھک کر فلک گنگا کے سینے سے

نہ بیڑوں کا پتا تھا اور نہ کوسوں گھاٹ ملتا تھا
جہاں تک کام کرتی تھیں نگاہیں پاٹ ملتا تھا

مویشی نیم جاں تھے ہوش پراں تھے درندوں کے
بہے جاتے تھے بچے آشیانوں سے پرندوں کے

کہیں بہتا نظر آتا تھا سامان خانہ داری کا
کہیں غرقاب ہوتا تھا سفینہ کشت کاری کا

کھلا تھا ہر طرف رنگِ شفق دریا کے پانی میں
کہ موجیں سرد انگارے اگلتی تھیں روانی میں

نہ کشتی کا نہ ساحل پر پتا تھا ناخداؤں کا
تسلط تھا فقط طوفاں کے خونی دیوتاؤں کا

بچارے بے گھرے بالی موالی روتے جاتے تھے
غریبوں کے مکاں موجوں کے لقمے ہوتے جاتے تھے

ہرن دلدل میں پھنس کر رہ گئے تھے خستہ جانی سے
نکل آئی تھیں اندھی مچھلیاں گھبرا کے پانی سے

فلک سے ہانپ کر بیمار سورج گرنے والا تھا
زمیں کی نعش پر کالا کفن فطرت نے ڈالا تھا

اسی نازک سمے میں جب تھے دونوں وقت ملنے کو
زمیں پر غش تھا طاری چرخ پر تھے پھول کھلنے کو

بہا آتا تھا اک چھپّر پہ اک اندھا پجاری بھی
جسے قسمت سے حاصل تھا کمالِ نغمہ باری بھی

بھجن گاتا ہوا آتا تھا اکتارے کی تانوں پر
ہوائیں لے کے تانیں جا رہی تھیں آسمانوں پر

بدن پر جوگیا بانا لٹیں شانوں پہ آوارہ
ہر اک موجِ نفس معراجِ روحانی کا ہرکارہ

نوا میں سوز بھی چہرے پہ نورِ حق پرستی بھی
تشکّک بھی خوشی بھی جذبِ خودداری بھی مستی بھی

نہ بے صبری نہ بے ہوشی نہ بے چینی نہ بے تابی
وہی مضراب کی ضربت وہی چہرے کی شادابی

تھانے تیرتے تھے جب بھری گنگا کے دھارے پر
تو اک گاتی ہوئی کشتی پہنچتی تھی کنارے پر

بھجن جل کر سے گردابوں میں گنگا بیٹھی جاتی تھی
جو لَے چھیڑتی تھی موجوں کے گریباں سیتی جاتی تھی

ہوائیں راگ کے پاکیزہ لہروں میں نہاتی تھیں
اندھیری رات کے بچپن کی گھڑیاں گنگناتی تھیں

اندھیرا جب ذرا گہرا ہوا اک دم فضا بدلی
ہُوا کم ہانپتا طوفان دیوانی ہوا بدلی

فسونِ کم روی فطرت نے پھونکا تیز دھارے پر
وہ بچھڑ رفتہ رفتہ آ لگا آخر کنارے پر

نکالا کھینچ کر دریا تیوں نے اس بچاری کو — کہ وہ پہلا فریضہ جانتے ہیں غم گساری کو
حریمِ دل میں غیرت شرم تھی آنکھوں کے پردوں میں — ابھی تک بھی یہاں مردانگی باقی ہے مردوں میں

گئے گزرے بھی اچھے ہیں یہ شہری کج کلاہوں سے
برس پڑتی ہیں اب بھی بجلیاں ان کی نگاہوں سے

کہا میں نے بچاری سے یہ آخر ماجرا کیا تھا — کہ یہ کف در دہاں طوفان اور تو نغمہ پیرا تھا

جواب اس نے دیا مجھ کو کہ سن اے شاعرِ دانا
فنا کو تو نے کیا سمجھا بقا کو تو نے کیا جانا؟

قضا آتی ہے جب دیتی نہیں اک پل بھی جینے کو — ڈبو دیتی ہے ظالم رہ گزاروں میں سفینے کو
تو پھر ہم موت کو اک لمحہ کیوں دیں زندگانی کا — کریں کیوں فکر کر کے رنگ پھیکا شادمانی کا

جو موت آتی ہے آتے مرد کو مرنے کا غم کیسا؟
عبارت ہیں خوشی کی دفتر رنج و الم کیسا؟

اختر شیرانی

تاثراتِ نغمہ

نظر کے سامنے رقصاں ہیں رنگیں وادیاں گویا!
شراب و شعر میں ڈوبی ہوئی ساری فضائیں ہیں
اُفق پر موج زن آوارہ خوابوں کی گھٹائیں ہیں
فضا میں بس رہی ہیں نور کی آبادیاں گویا!
خلا میں پر فشاں ہیں خواب کی شہزادیاں گویا!
بہار و کیف سے لبریز مستانہ ہوائیں ہیں
اور ان میں منتشر غمگین روحوں کی صدائیں ہیں
مہیا ہیں سکون و ہوش کی بربادیاں گویا!

وہ دنیا ہے جہاں جنت کے نظارے برستے ہیں
شفق کی سطح پر آباد خوابوں کے جزیرے ہیں
ستاروں کے سمندر ماہتابوں کے جزیرے ہیں
بہاریں منظروں میں پھول اور تارے برستے ہیں
فضا ہے مست موجِ نکہتِ بادِ بہاری سے
اور اس پر تیرتا پھرتا ہوں میں بے اختیاری سے

وادیٔ گنگا میں ایک رات

کرتے ہیں مسافر کو محبت سے اشارے
ای وادیٔ گنگا ترے شاداب نظارے
یہ بکھرے ہوئے پھول یہ نکھرے ہوئے تارے
خوش بو سے جھکتے ہوئے دریا کے کنارے

یہ چاندنی رات اور یہ پُرخواب فضائیں
اک موجِ طرب کی طرح بے تاب فضائیں
سبزے کا ہجوم اور یہ شاداب فضائیں
جھکے ہوئے نظارے ہیں بہکے ہوئے تارے

یہ تارے ہیں یا نور کے مے خانے ہیں آباد
معصوم حسیں حوروں کے کاشانے ہیں آباد
مستانہ ہواؤں پر پری خانے ہیں آباد
یا دامنِ افلاک میں بے تاب شرارے

مہتاب ہے یا نور کی خوابیدہ پری ہے
الماس کی صورت ہے کہ مندر میں دھری ہے
مرمر کی صراحی مئے سیمیں سے بھری ہے
اور تیرتی ہے نیل کی موجوں کے سہارے

نیندوں میں ہیں کھوئی ہوئی بیدار ہوائیں
گل زار ہیں گل ریز گہر بار ہوائیں
یا نور میں ڈوبی ہوئی سرشار ہوائیں

یا بال فشاں مستیٔ نکہت کے نظارے

صحرا ہیں کہ خوابیدہ نظاروں کے شبستاں
دامن میں لیے چاند ستاروں کے شبستاں
فردوس کی پُر کیف بہاروں کے شبستاں

شاکر تمنا ہے یہیں رات گزارے

جوگن

دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے
موسیقیٔ حزیں کے دریا بہا رہی ہے

غمگین نوائیوں سے بیخود بنا رہی ہے
دنیا کے ہر اثر کو دل سے مٹا رہی ہے

سوئی ہوئی فضا کا شانہ ہلا رہی ہے
ہر جنبشِ زباں سے مردے جلا رہی ہے

بیدار کر رہی ہے مدہوش گھاٹیوں کو
خوابیدہ ساحلوں کی نیندیں اڑا رہی ہے

ہر لرزشِ صبا میں طوفاں امڈ رہے ہیں
پنچھی ہیں کیا رسیلی تانیں اڑا رہی ہے

دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

اٹھکھیلیوں کا سن ہے ہنس بولنے کے دن ہیں
لیکن نہ جانے کیوں وہ آنسو بہا رہی ہے

آئینہ رنگ سینہ گچھ کھل رہا ہے جس میں
دو شیزگی کی گنگا طوفان اٹھا رہی ہے

اک گیروانہ ساری میں ہے بدن چھپائے
یا ہلکی ہلکی بدلی سورج پہ چھا رہی ہے

اک بکھریا سمیں پر لہرا رہی ہے ناگن
یا اس کی زلفِ مشکیں سینے پہ آ رہی ہے

ہے اک ستار اس کی آغوشِ نازنیں میں
وہ نازک انگلیوں سے جس کو بجا رہی ہے

دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں جا رہی ہے

سبزے پہ چاندنی کے بادل برس رہے ہیں — یا کوئی حورِ جنت آنسو بہا رہی ہے
ہے موج زن ہوا میں اک آبشار سیمیں — یا ملکۂ پرستاں موتی لٹا رہی ہے
اک گرد مرمریں ہے چھائی ہوئی افق پر — جس کو ہوائے صحرا کوسوں اڑا رہی ہے
اک موجِ گوہریں سی ہر پھول پر ہے رقصاں — نغمہ کی بوئے رنگیں جس میں سما رہی ہے
یا دن کے مقبرے پر دوشیزۂ شب آکر — گلہائے نور کی اک چادر چڑھا رہی ہے

دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

جنگل کے جانور کچھ بیٹھے ہیں اس کے آگے — رو رو کے جن کو اپنی بپتا سنا رہی ہے
خونخوار شیر بھی ہیں وحشی غزال بھی ہیں — لیکن وہ سب کے دل پر سکہ جما رہی ہے
کچھ سانپ جھومتے ہیں رہ رہ کے مست ہوکر — اک موجِ وجد آور ان کو نچا رہی ہے
طاؤس ناچتا ہے یوں بے قرار ہوکر — گویا ہر ایک پر میں بجلی سما رہی ہے
غمگین نوائیوں سے ایسا سماں بندھا ہے — رو رو کے جیسے فطرت طوفاں اٹھا رہی ہے

دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

یہ موہنی بنی ہے کس کی لگن میں جوگن — یہ سیل درد کس کے غم میں بہا رہی ہے
ہاں شاید اس کی ننھی معصوم آتما میں — ہر کی پریم اگنی لو کے لگا رہی ہے
ہر بن میں ہر نگر میں ہر گھر میں ہر ڈگر میں — پھر پھر کے اپنے دل کی چنتا مٹا رہی ہے
یا ہر کی جستجو میں پیتم کی آرزو میں — کاشی سے آ رہی ہے متھرا کو جا رہی ہے
یا جگ کی آفتوں سے تنگ آ کے بن میں جا کے — پرماتما کو اپنا دکھڑا سنا رہی ہے

دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

اب نغمے سو گئے ہیں باجا بھی تھک چلا ہے — محشر اُٹھا چکی ہے فتنے جگا رہی ہے
ایسی دبی صدا ہے گویا عروسِ نغمہ — منہ پھیر کر ہوا سے دامن چھڑا رہی ہے
یا کچھ غنودگی کے عالم میں مست کوئل — دھرتی کی گوپیوں کا دل گدگدا رہی ہے
کچھ کھل گیا ہے جیسے بادل کوئی برس کر — یا شمع جل جلا کر اب جھلملا رہی ہے
لو وہ ستار کو بھی نیند آ گئی بغل میں — لو وہ ستار اُٹھا کر جنگل سے جا رہی ہے

دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

میں تو مگر کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں — جیسے وہ ظالم اب تک ویسے ہی گا رہی ہے
اب تک فضا پہ ہے وہ کھویا ہوا سا عالم — اب تک اُفق پہ یکسر مستی سی چھا رہی ہے
اب تک اُٹھا رہا ہے ساز اس کا ابرِ نغمہ — اب تک زبان اس کی بجلی گرا رہی ہے
پھولوں سے اب تک اس کے نغمے ٹپک رہے ہیں — پتوں سے اب تک اس کی بجلی گرا رہی ہے
اب تک میں سر جھکائے حیرت زدہ کھڑا ہوں — اب تک وہی تجلی آنکھوں پہ چھا رہی ہے

دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

علی اختر

شاعر فلسفی سے

تری نگاہ ہی وابستۂ فریبِ نمود — بہ ایں رعونتِ پندار و نازِ بینائی
جگا سکی نہ تجھے اے رہینِ خوابِ گراں — بہار کی چمن افروز نغمہ پیمائی
مٹا سکی نہ تری روح کی جبیں سے شکن — فروغِ ماہ میں لیلائے شب کی رعنائی
گرا سکی نہ کبھی بجلیاں ترے دل پر — سوادِ شب میں عروسِ سحر کی انگڑائی
تجھے نہ کیف کے رازوں سے کر سکا آگاہ — تبسمِ لبِ شیریں، جمالِ برنائی
یہاں کہ ذرۂ خاکی ہے آفتاب فروش — یہاں کہ ریزۂ مینا ہے جامِ صہبائی
یہاں کہ سینۂ خس میں رواں ہے روحِ بہار — یہاں کہ رقصِ شرر میں ہے نورِ سینائی
تجھے خبر بھی ہے ناواقفِ سرشتِ حیات — کہ رازِ بے خبری ہے کمالِ دانائی

ہوا نہ صرفِ یقیں رنگِ احتمال ترا
تغیرات کی زد میں رہا کمال ترا

اگرچہ میں بھی ہوں گم کردۂ طلسمِ حیات — مجھے ہی کھیل مگر اس جہاں کی بوالعجبی
یہ جانتا ہوں کہ ہے اک ادائے پرتوِ رنگ — تلاطمِ سحری ہو کہ خوابِ نیم شبی
ملا ہے فیض سے فطرت کے وہ دلِ آگاہ — کہ موجِ بادۂ عرفاں ہے میری تشنہ لبی
غلط نہیں ہے اگر ہو نژادِ کیف و جمال — خسِ ذلیل کو بھی دعوئے چمن نسبی
کشش ہے کس کی کہ از ماہ تا بماہی آب — ہر ایک ذرہ ہے آسودۂ غمِ طلبی

ملے جو ساغرِ زہرِ آب مسکراتا ہوں
کہ اس میں پاتا ہوں میں روحِ آتشِ عنبی

کسی کا عکس ہی نبضِ حیات کی جنبش
یہ کائنات ہی ہم رنگِ شیشۂ حلبی

مجھے تلاش ہی جس کی وہ مِل چکا ہی مجھے
یہ ایں جسارتِ رندی و شانِ بے ادبی

ہجوم دہر میں سرگرمِ اہتمام ہوں میں
فنا پذیر ہی تو طالبِ دوام ہوں میں

غزل

فریبِ جلوہ کہاں تک بروئے کار رہے
نقاب اُٹھاؤ کہ کچھ دن ذرا بہار رہے

خرابِ شوق رہے وقفِ انتظار رہے
اب اور کیا ترے وعدوں کا اعتبار رہے

میں رازِ عشق کو رسوا کروں معاذاللہ
یہ بات اور ہی دل پر نہ اختیار رہے

پھر اہلِ شوق ہیں سرگرمِ اہتمامِ نظر
وہ رقصِ برقِ تجلّی پھر ایک بار رہے

سکونِ عشرتِ کونین اس کا حصّہ ہی
وہ دل جو تیرے تصوّر میں بے قرار رہے

چمن میں رکھ تو رہا ہوں بنا نشیمن کی
خدا کرے کہ زمانہ بھی سازگار رہے

جنوں کا رُخ ہی حریمِ حیات کی جانب
الٰہی پردۂ اوہام اعتبار رہے

جہاں میں قدرِ سکون اس سے پوچھیے اختر
وہ غم نصیب جو اک عمر بے قرار رہے

اختر انصاری

آرزو

دل کو برباد کیے جاتی ہے — غم بدستور دیے جاتی ہے
مرچکیں ساری اُمیدیں اختر — آرزو ہے کہ جیے جاتی ہے

ضبطِ اشک

ان آنسوؤں کو ٹپکنے دیا نہ تھا میں نے — کہ خاک میں نہ ملیں میری آنکھ کے تارے
بس ان کو ضبط نہ کرتا اگر خبر ہوتی — پہنچ کے قلب میں بن جائیں گے یہ انگارے

شعرگوئی

خوں بھرے جام انڈیلتا ہوں میں — ٹیس اور درد جھیلتا ہوں میں
تم سمجھتے ہو شعر کہتا ہوں — اپنے زخموں سے کھیلتا ہوں میں

محبّت

محبت ہے ایک خوش نما شوخ کانٹا — جو چبھتا ہے آنکھوں کے پردوں میں پہلے
وہ پھر بیٹھ جاتا ہے دل کی رگوں میں — خلش اوّل اور بعد میں درد بن کے

افسردہ چاندنی

موت کی سی پُرسکوں ویرانیاں عرش سے تا فرش ہیں چھائی ہوئی
چاندنی پھیلی ہوئی ہے ہر طرف رات کی میت ہے کفنائی ہوئی

مُسکراہٹ اور ہنسی

مُسکرائی وہ جب تو میں سمجھا کسی بربط سے نغمہ پھوٹ پڑا
ہنس پڑی وہ تو یہ ہوا معلوم دستِ ساقی سے جام چھوٹ پڑا

جفائے آرزو

وہ کانٹا کہ تھی جس سے چاہت مراد مرے دل میں پائی جگہ، رہ گیا
گیا دل کو ویراں لہو چوس کر مگر خود چبھا کا چبھا رہ گیا

اظہارِ محبت

بہزؔ نے حسرت سے کہا تم سے محبت ہے مجھے
تم نے شرماتے ہوئے مجھ کو جواب اس کا دیا
آہ لیکن دلِ ناشاد یہ غارت ہو جائے
اس قدر زور سے دھڑکا کہ بتا کچھ نہ سکا

فطرت

یہاں سے دور جنگل میں رہا کرتی ہے اک دیوی
وہ غم دیدہ دلوں کو غم کے بدلے عیش دیتی ہے
میں جب روتا ہوا جاتا ہوں اس کی بزمِ عشرت میں
تو بڑھ کر ریشمی آنچل سے آنسو پونچھ لیتی ہے

مبتلائے محبت

تو جو راتوں کو اُٹھ کے روتا ہے — آہ کیوں اپنی جان کھوتا ہے
ہم تمھیں چاہتے ہیں تم ہم کو — بس فسانوں میں ہی یہ ہوتا ہے

برسات

مہین پھوار کے قطرے ہیں برف کے ریزے — بھری ہوئی ہیں ہواؤں میں خنکیاں یکسر
فضا ہے بھیگی ہوئی اور جل رہا ہوں میں — خدا کی مار سلگتی ہوئی جوانی پر

رازِ دروں

تکلیف یہ ہر وقت کی ہوتی نہیں برداشت — یہ بارِ الم آہ اٹھایا نہیں جاتا
وہ راز کہ اغیار سے کہہ بھی نہیں سکتے — سینے میں بھی اللہ چھپایا نہیں جاتا

آرزو لکھنوی

غم دے تو دل بھی شمع کا پروردگار دے
جو ساری عمر ایک طرح پر گزار دے

جس دل میں ہو نہ کیفِ محبت وہ دل نہیں
ساغر وہ ہے جو بوئے مئے خوشگوار دے

اک انتظارِ وعدۂ دیدار کے لیے
مہلت کچھ اور زندگیٔ مستعار دے

لازم ہے عہد نامۂ الفت پہ مُہر بھی
لیتا ہے دل تو داغ بھی اک گل عذار دے

ہر وقت یہ بھی ہو نہ سکا شوقِ دید سے
جاتے ہوئے حواس کو بڑھ کر پکار دے

بے اختیار ہو کے رہا دل تو کیا رہا
ایسی فضول شے بھی نہ پروردگار دے

بے کیف زندگی کا نتیجہ کوئی نہیں
دے اضطراب بھی جو خدا انتظار دے

ہوتا ہے خامشی سے بھی اظہارِ حالِ دل
خالق زبان دے کہ نہ دے اعتبار دے

انساں کے دل بھرے ہیں جو کچھ ہے زباں ہے
یہ ایک پانسہ پھینک کے جو چاہے ہار دے

مارا پڑے گا جوشِ جوانی میں آرزو
غفلت میں یہ خراب زمانہ گزار دے

رونے پہ مرے ہنستے کیا ہو سبب پوچھے نہ دیوانہ جانو
دل کس سے لگایا ہے تم نے تم درد کسی کا کیا جانو

کہہ سکتے نہیں یہ بھی موسیٰ ہوش اڑنے سے پہلے کیا دیکھا
دیدار کہ جلوہ کیسا اس کو بھی بس اک پردا جانو

رونے پہ کسی کے کوئی ہنسے ہنسنے پہ کسی کے کوئی روئے
جو بات ہے جس کی وہ جانے ہم کیا سمجھیں تم کیا جانو

ہر چند سمجھ کیا سکتے ہو چپ رہ کے مری خاموشی کو
بت بن چکے اب انسان بنو اُتنا تو کہو جتنا جانو

کہنے سے نہ کہنا ہی اچھا نادان سے پردا ہی اچھا
ہر طرح ہی اچھا ہی اچھا تم حال نہ جانو یا جانو

مایوس وہ دل ہے پہلو سے آخر کہو کس کا ہو کے رہے
جس کو نہ ہمیں اچھا سمجھوں جس کو نہ تمہیں اپنا جانو

میدانِ تصور محکم ہے آزاد خیالی کیا کم ہے
بے قید جنوں کا عالم ہے زنداں بھی ہو تو صحرا جانو

سیلاب نگاہِ حسرت زا جب چاہے ڈبو دے یہ دنیا
سمجھو نہ اسے سوکھا چشمہ بہتا ہوا اک دریا جانو

اے آرزو ان سے تم نہ کھنچو بڑھ جائے گی وحشت دیکھو تو
اس سلسلۂ بے ربطی کو زنجیرِ جنوں افسانہ جانو

پانی میں آگ دھیان سے تیرے بھڑک گئی
آنسو میں کوندتی ہوئی بجلی جھلک گئی

کب تک یہ جھوٹی آس کہ اب آگئے وہ اب آئے
پلکیں جھپکیں، پپوٹے سُتے، آنکھ تھک گئی

ندی بھی آنسوؤں نے بہا دی تو کیا ہوا
کھولن جو تھی لہو میں نہ وہ آنچ تک گئی

دونوں کو ایک کرتی ہے بڑھ کر لگی کی آگ
اٹھی یہاں سے آنچ وہاں تک لپک گئی

یہ دن دہاڑے سامنے کون آگیا کہ دھوپ
بڑھتے ہی چھاؤں تو کانپ کے پیچھے سرک گئی

کھلنا کہیں چھپا بھی ہے چاہت کے پھول کا
لی گھر میں سانس اور گلی تک مہک گئی

آنسو رکے تھے آنکھ میں دھڑکن کا ہو برا
ایسی اٹھان دی کہ پیالی چھلک گئی

میری سنک بھی بڑھتی ہے ان کی ہنسی کے ساتھ
چٹکی کلی کہ پاؤں کی بیڑی کھڑک گئی

جس نے اُڑا دی راتوں کی نیند اور دن کا چین
جی سے نہ پھر بھی آرزو اس کی للک گئی

جو سامنے اب تک آئے نہیں کیوں دھیان میں آئے جاتے ہیں
آنکھوں سے ابھی تک اوجھل ہیں اور جی میں سمائے جاتے ہیں
ان اُلٹی سیدھی باتوں سے ہم تو گھبرائے جاتے ہیں
ڈھارس بھی دیے جاتے ہیں وہ آنسو بھی بہائے جاتے ہیں
جب ان کے جھوٹے اپنے بھی سُن لینے کو تیار رہیں ہم!
چُک جائے جھگڑا آپس میں کیوں لوگ بلائے جاتے ہیں
ہٹ اپنی اپنی بات کی ہے دھیان اپنی اپنی آن کا ہے
ہم ہیں کہ تلے ہیں مٹنے پر وہ ہیں کہ مٹائے جاتے ہیں
جینا ہے تو دُکھ بھی ہیں سکھ بھی رونا بھی ہے ہنسنا بھی ہے
بین ایک ہی ہوتی ہے جس پر سب راگ بجائے جاتے ہیں
اب آرزو اس پھلواری میں بسنے کا سہارا کوئی نہیں
دو سوکھے تنکے لا کے رکھو تو وہ بھی جلائے جاتے ہیں

متفرقات

قید کی حد میں بڑھا لی ہم نے آزادی کی حد
یوں دیا جھٹکا کہ حلقے کھنچ گئے زنجیر کے

ای سانس نہ آکہ دل میں ہی زخم   ٹیس اُٹھتی ہی جب ہوا لگی ہی

اب ایسے نہ تھے ہم کو چھیڑو تو رودیں   بہا ہوگا کوئی کلیجے کا چھالا

کالی گھٹائیں کوندا پکارا روئے جو کویل کوک گئی
جتنی گہری سانس کھنچی تھی اتنی لمبی ہوک گئی

جمع ہوئے ہیں کچھ حسین گرد مرے مزار کے   پھول کہاں سے کھل گئے دن تو نہ تھے بہار کے

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا مےخانہ بھی

اشکوں سے راز کھلتا کیا خونِ آرزو کا   آنکھوں تک آتے آتے رنگ اُڑ گیا لہو کا

غم دیا ہی کہ مسرت دی ہی   سب میں اک طرح کی لذت دی ہی

آزاد انصاری

نرالی آن پیدا کر، انوکھی شان پیدا کر — جگر زخمی، دل آشفتہ، نظر حیران پیدا کر
محبّت تجھ کو آدابِ محبّت خود سکھا دے گی — ذرا آہستہ آہستہ ادھر رجحان پیدا کر
جو الفت ہے تو الفت کی نظر سے مطمئن فرما — جو دعویٰ ہے تو دعوے پر کوئی بُرہان پیدا کر

اگر آزاد سا درویش آنکھوں میں نہیں جچتا
تو جا اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

آؤ پھر موقع ہے کچھ اسرار کی باتیں کریں — صورتِ منصور پھر کیں دار کی باتیں کریں

آؤ پھر عہدِ وصالِ یار کی باتیں کریں — داستانِ لطف چھیڑیں پیار کی باتیں کریں
آؤ پھر اس جلوۂ گل بار کی باتیں کریں — پھول برسائیں گُل و گلزار کی باتیں کریں

آؤ پھر اس ساقیٔ دلبر کا چھیڑیں تذکرہ — آؤ پھر اس شاہدِ مے خوار کی باتیں کریں
آؤ پھر اس ہمدمِ کافر کا چھیڑیں تذکرہ — آؤ پھر اس یارِ نادیدہ دار کی باتیں کریں

آؤ پھر ارمانِ محرابِ عبادت بھول جائیں — آؤ پھر اس ابروئے خم دار کی باتیں کریں
آؤ پھر ایقانِ اعجاز و کرامت بھول جائیں — آؤ پھر اس لعلِ افسوں کار کی باتیں کریں

آؤ پھر اس دل شکن انکار کا قصّہ سنائیں — آؤ پھر اس جاں فزا اقرار کی باتیں کریں

آؤ پھر اس بامزہ تکرار کا قصہ سنائیں — آؤ پھر اس صلح نا پیکار کی باتیں کریں
حضرت آزادؔ سب نا محرم اسرار ہیں — کس سے بے خوفِ فساد اسرار کی باتیں کریں

~~~~~~

بیانِ رازِ دل کی خواہشیں اور وہ بھی ممبر پر — خبر بھی ہے یہ باتیں دار پہ کہنے کی باتیں ہیں

~~~~~~

کس کی اٹکاوٹ کس کی لاگ — بھاگ بلائے عشق سے بھاگ
زلفوں والو! یہ اندھیر — دُہرے دُہرے کالے ناگ

~~~~~~

ضرورت ہے کہ میرا قصۂ غم ہر زباں پر ہو — نصیحت کی نصیحت ہے کہانی کی کہانی ہے

~~~~~~

وہی تم کہ خواہشِ جان و دل، وہی دل کی کاہشِ جاں گسل
وہی تم ہو اور وہی جیت ہے، وہی ہم ہیں اور وہی ہار ہے

~~~~~~

شرحِ دردِ دل سے شرحِ درد ہی مطلب نہیں
خود تڑپنا بھی ہے دنیا بھر کو تڑپانا بھی ہے

~~~~~~

نہ دنیا کا مجھے رکھا نہ دین کا — گلہ ہے تیرے لطفِ بے کراں سے
ارے او صبر و سکوں لے جانے والے — بتا! صبر و سکوں لاؤں کہاں سے

~~~~~~

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی — خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

~~~~~~

آ مگر اس قدر قریب نہ آ — کہ تماشا محال ہو جائے

جو بتوں کو خدا سمجھتے ہیں — وہ نہیں جانتے خدا کیا ہی

عشق میں اپنا جی نہ تیاگ — عشق نہیں ہی آگ ہی آگ
کس کی لگاوٹ کس کی لاگ — بھاگ بلائے حسن سے بھاگ

نثار اس شوخ کے جس نے شبِ وصل — خود آئینِ ہم آغوشی سکھایا
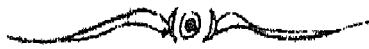
اصغر حسین اصغر گونڈوی

انتخابِ غزلیات

خوب دن تھے ابتدائے عشق کے — اب دماغِ نالہ و شیون کہاں
سارے عالم میں کیا تجھ کو تلاش — تو ہی بتلا ہی رگِ گردن کہاں

~~~~~

فتنہ سامانیوں کی خو نہ کرے — مختصر یہ کہ آرزو نہ کرے
پہلے ہستی کی ہے تلاش ضرور — پھر جو گم ہو تو جستجو نہ کرے
ماورائے سخن بھی ہے کچھ بات — بات یہ ہے کہ گفتگو نہ کرے

~~~~~

رُخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسّم ہائے پنہاں کی
شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی
نقاب اس نے الٹ کر یہ حقیقت ہم پہ عریاں کی
یہیں پر ختم ہو جاتی ہیں بحثیں کفر و ایماں کی
حقیقت کھول دیتا ہے جنوں کے رازِ پنہاں کی
قسم دے دی ہے لیکن قیس نے چاک گریباں کی
اسیرانِ بلا کی حسرتوں کو آہ کیا کہیے
تڑپ کے ساتھ اونچی ہو گئی دیوارِ زنداں کی

~~~~~
~~~~~

اک عالم حیرت ہی فنا ہی نہ بقا ہی — حیرت بھی یہ حیرت ہی کہ کیا جانیے کیا ہی
سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی — کچھ خواب ہی کچھ اصل ہی کچھ طرز ادا ہی

~~~~~~

پہلی نظر بھی آپ کی اُف کس بلا کی تھی — ہم آج تک وہ چوٹ ہیں دل پر لیے ہوئے
اصغرؔ حریم عشق میں ہستی ہی جرم ہی — رکھنا کبھی نہ پاؤں یہاں سر لیے ہوئے

~~~~~~

ترے جلووں کے آگے ہمت شرح بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھدی نگاہِ بے زباں رکھ دی
مٹی جاتی ہی بُلبل جلوۂ گُل ہائے رنگیں پر
چُھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی
کرشمے حسن کے پنہاں تھے شاہد رقصِ بسمل پر
بہت کچھ سوچ کر ظالم نے تیغِ خوں فشاں رکھ دی
الٰہی کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہی
غضب کی ایک مشتِ خاک زیرِ آسماں رکھ دی

~~~~~~

بے محابا ہو اگر حسن تو وہ بات کہاں — چھپ کے جس شان سے ہوتا ہی نمایاں کوئی
خرمنِ گل سے لپٹ کر وہیں مرجانا تھا — اب کرے کیوں گلۂ تنگیِ داماں کوئی
کیا مرے حال پہ سچ مچ اُنھیں غم تھا قاصد — تو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی

~~~~~~

نہ کچھ فنا کی خبر ہی نہ ہی بقا معلوم — بس ایک بے خبری ہی سو وہ بھی کیا معلوم

ہم ایک بار جلوۂ جانانہ دیکھتے — پھر کعبہ دیکھتے نہ صنم خانہ دیکھتے
اک شعلہ اور شمع سے بڑھ کر ہے رقص میں — تم چیر کر تو سینۂ پروانہ دیکھتے

ہزار جامہ دری صد ہزار بخیہ گری — یہاں ہے خیر سے سب کچھ شمار بے خبری
مزاجِ عشق بہت معتدل ہوا ان روزوں — جگر میں آگ دبی ہے آنکھوں میں ہے تری
جو مجھ پہ گزری ہے شب بھر وہ دیکھ لے ہمدم — چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے — پردے پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے
لو شمعِ حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے — فانوس کی گردش میں کیا کیا نظر آتا ہے

اس طرح چھیڑیے افسانۂ ہجراں کوئی — آج ثابت نہ نظر آئے گریباں کوئی

کثرتِ مظاہر ہے دفتر فنا آموز — نیند آئی جاتی ہے حسن کے فسانے سے
ایک ایک تنکے پر سوختگی طاری — برق بھی لرزتی ہے میرے آشیانے سے

نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی
چمن میں کس مزے سے چھیڑتی ہے غنچہ و گل کو
مگر موجِ صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی
اڑا دیتا ہوں اب بھی تار تار ہست و بود اصغرؔ
لباس زہد تمکیں پر بھی عریانی نہیں جاتی

غزل

گلوں کی جلوہ گری مہر و مہ کی بوالعجبی
تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی

گزر گئی ترے مستوں پہ یہ بھی تیرہ شبی
نہ کہکشاں نہ ثریا نہ خوشۂ عنبی

یہ زندگی ہے یہی اصل علم و حکمت ہے
جمال دوست و شب ماہ و بادۂ عنبی

فروغ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے
ادا و رسم ہلالی و طرز بولہبی

ہجوم غم میں نہیں کوئی تیرہ بختوں کا
کہاں ہے آج تو اے آفتاب نیم شبی

سرشت عشق طلب اور حسن بے پایاں
حصول تشنہ لبی ہے مزید تشنہ لبی

وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں
جہاں سے تو نے لیے خندہ ہائے زیر لبی

کشش نہ جام نگاریں کی پوچھ اے ساقی!
جھلک رہا ہے مرا آب و رنگ تشنہ لبی

آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا

ہیں کامیاب دید بھی محروم دید بھی
جلووں کے اژدحام نے حیراں بنا دیا

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

کچھ شورشوں کی نذر ہوا خون عاشقاں
کچھ جم کے رہ گیا اسے حرماں بنا دیا

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیر عشق کی
جب خاک کر دیا اسے عرفاں بنا دیا

کیا کیا قیود دہر میں ہیں اہل ہوش کے
ایسی فضائے صاف کو زنداں بنا دیا

اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موج زن
آج اس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا

مجبوری حیات میں راز حیات ہے
زنداں کو میں نے روزن زنداں بنا دیا

وہ شورشیں نظام جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیش تر — تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

بلبل بہ آہ و نالہ و گل مست رنگ و بو — مجھ کو شہید رسم گلستاں بنا دیا

کہتے ہیں اک فریب مسلسل ہے زندگی — اس کو بھی وقفِ حسرت و حرماں بنا دیا

غزل

وہ نغمہ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے — کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے

نظر وہ ہی جو اس کون و مکاں کے پار ہو جائے — مگر جب روئے تاباں پر پڑے بیکار ہو جائے

تبسم کی ادا سے زندگی بیدار ہو جائے — نظر سے چھیڑ دے رگ رگ مری ہشیار ہو جائے

تجلی چہرۂ زیبا کی ہو کچھ جام رنگیں کی — زمیں سے آسماں تک عالمِ انوار ہو جائے

تم اس کافر کا ذوقِ بندگی اب پوچھتے کیا ہو — جسے طاقِ حرم بھی ابروئے خمدار ہو جائے

سحر لائے گی کیا پیغامِ بیداری شبستاں میں — نقابِ رخ الٹ دو خود سحر بیدار ہو جائے

نظر اس حسن پر ٹھہرے تو آخر کس طرح ٹھہرے — کبھی جو پھول بن جائے کبھی رخسار ہو جائے

کچھ ایسا دیکھ کر چپ ہوں بہارِ عالمِ امکاں — کوئی اک جام پی کر جس طرح سرشار ہو جائے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

حامد اللہ افسر

چاند

تم ندی پر جا کر دیکھو — جب ندی میں نہائے چاند
ڈبکی لگائے غوطہ کھائے — ڈر ہے ڈوب نہ جائے چاند

کرنوں کی ایک سیڑھی لے کر — چھم چھم اُترا آئے چاند
جھولے میں پانی کی لہروں کے — کیا کیا پینگ بڑھائے چاند

جب تم اس کو پکڑنے جاؤ — بادل میں چھپ جائے چاند
پھر چپکے سے نکل کر دیکھے — اور پھر خود کو چھپائے چاند

چاہے جدھر کو جاؤ افسرؔ
ساتھ تمھارے جائے چاند

مالن کا گیت

جی دکھتا ہے کیسے توڑوں
چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی پیاری پیاری کلیاں
لے کانٹے میں بیچ بیچ دوں
تیرے سارے پتے ڈنٹھل میری ساری کلیاں
یا اللہ میں صبح کو پاؤں
ننھی ننھی اچھی اچھی پیاری پیاری کلیاں

مسافر

ہی تنہا راہ میں گھبرائے گا دل — کہاں ہی ای مسافر تیری منزل ؟
سحر کی سرخ لہروں میں نہا کر — نظر جہر منور سے بچا کر
فضائے نیلگوں میں جب بڑھوں گا — تو منزل کا پتا کچھ دے سکوں گا

سفر تیرا ہی مشکل ای مسافر — ہی کتنی دور منزل ای مسافر ؟
مسافر ہوں سفر ہی میرا مقصود — میری منزل میرے دل میں ہی موجود
سفر کی حد اگر معلوم ہوتی — سفر کی کیفیت معدوم ہوتی
سفر میں رات کا کٹنا ہی دوبھر — گزارے گا مسافر رات کیوں کر
زمیں سے آسماں تک رہگزر ہی — سفر کی رات ہی جان سفر ہی
خموشی کو جلائے درد دوں گا — کہانی اپنی تاروں سے کہوں گا
فلک پر نور افگن ماہ ہوگا — مسافر رات کا ہمراہ ہوگا

محبت میں ہیں دونوں داغ بر دل
مسافر ہیں مگر گم کردہ منزل

اکبر حسین اکبر الہ آبادی

برقِ کلیسا

رات اِس مِس سے کلیسا میں ہُوا میں دوچار
ہائے وہ حُسن، وہ شوخی، وہ نزاکت، وہ اُبھار
زلفِ پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید
قدِ رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں
گال وہ صبحِ درخشاں کہ ملک پیار کریں
دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رُک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں
پہلوئے حُسنِ بیاں شوخیٔ تقریر میں برق
ٹرکی و مصر و فلسطین کے حالات میں غرق
ضبط کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ہُوا
یا حفیظ کا کیا ورد مگر کچھ نہ ہُوا
عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار
تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میری ہو جائے
ساری دُنیا کو مرے قلب سے سیری ہو جائے

حاصلِ صد عرضِ غم مایۂ صد عرضِ شوق　　اک مترنم سکوت اک متبسم نگاہ
کون تجھے پا سکے کس کو ہے یہ دست گاہ　　عشق سو گم کردہ ہوش عقل سو گم کردہ راہ
اس کے سوا اور کیا پیشکشِ حسنِ دوست
ایک دھڑکتا سا دل ایک لرزتی سی آہ

شوق کو ردہ نما بنا، ہو چکا کبھی نہ دیکھ　　آگ دبی ہوئی نکال آگ بجھی ہوئی نہ دیکھ

نگہ یار کے مخصوص اشاروں کے سوا　　مذہبِ عشق میں ہے کفر نہ ایماں کوئی

دل کو برباد کر کے بیٹھا ہوں　　کچھ خوشی بھی ہے کچھ ملال بھی ہے

کیا جانیے کب آہ کی تاثیر جاگ اٹھے　　گہری نگاہ سے مجھے دیکھا نہ کیجئے

انھیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم　　پیامِ دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

مانوسِ اعتبارِ کرم کیوں کیا مجھے　　اب ہر خطائے شوق اسی کا جواب ہے

اک لفظِ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے　　سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے
کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے　　ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے
آنکھوں میں نمی سی ہے چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں　　نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے
یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجئے　　اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

کچھ جو پشیمانِ جفا ہو گئے   اور وہ گھبرا کے خفا ہو گئے

وہ عالم ہے اب خشک آنکھوں میں اپنی   کہ طوفاں ہی رہا روانی نہیں ہے

اُس نے شانوں پہ زلفِ برہم کی   خیر یارب نظامِ عالم کی
یوں تو پیاسے ہیں سبزہ و گُل بھی   کس نے دیکھی ہے پیاس شبنم کی
آتی تھی آج بھی نسیمِ سحر   آگ بھڑکا گئی جہنّم کی
اللہ اللہ ہستیٔ شاعر   قلب غنچے کا آنکھ شبنم کی

حُسن کامل ہے ترا اور بھی کامل ہو جائے   میری گستاخ نگاہی بھی جو شامل ہو جائے

سکرِ شباب دیا دبا درد فراق و انتظار   آنکھ کھُلی سلا دیا آنکھ لگی جگا دیا

جوشؔ ملیح آبادی

حُسن اور مزدوری

ایک دوشیزہ سڑک پر دھوپ میں ہے بے قرار
چوڑیاں بجتی ہیں کنکر کوٹنے میں بار بار

چوڑیوں کے ساز میں یہ شور ہے کیسا بھرا
آنکھ میں آنسو بنی جاتی ہے جس کی ہر صدا

گرد ہے رخسار پر زلفیں اٹی ہیں خاک میں
نازکی بل کھا رہی ہے دیدۂ غمناک میں

ہو رہا ہے جذب مہرِ خوں چکاں کے روبرو
کنکروں کی نبض میں اُٹھتی جوانی کا لہو

دھوپ میں لہرا رہی ہے کاکلِ عنبر سرشت
ہو رہا ہے کمسنی کا سوچ جزوِ سنگ و خشت

پی رہی ہیں سرخ کرنیں مہرِ آتش بار میں
نرگسی آنکھوں کا رس بے چینیٔ رخسار میں

غم کے بادل خاطرِ نازک پہ ہیں چھائے ہوئے
عارضِ رنگیں ہیں یا دو پھول مرجھائے ہوئے

چیتھڑوں میں دیدنی ہے روئے رنگین شباب
ابر کے آوارہ ٹکڑوں میں ہو جیسے ماہتاب

اُف یہ ناداری مرے سینے سے اٹھتا ہی دھُواں
آہ ای افلاس کے مارے ہوئے ہندوستاں

حسن ہو مجبور کنکر توڑنے کے واسطے
دستِ نازک اور پتھر توڑنے کے واسطے

فکر سے جھک جائے وہ گردن تف ای لیل و نہار
جس میں ہونا چاہیے پھولوں کا اک ہلکا سا ہار

آسماں جانِ طرب کو وقفِ رنجوری کرے
صنفِ نازک بھوک سے تنگ آ کے مزدوری کرے

بھیک میں وہ ہاتھ اٹھیں التجا کے واسطے
جن کو قدرت نے بنایا ہو حنا کے واسطے

نازکی سے جو اُٹھا سکتی نہ ہو کاجل کا بار
ان سُبک پلکوں پہ بیٹھے راہ کا بوجھل غبار

کیوں فلک مجبور ہوں آنسو بہانے کے لیے
انکھڑیاں ہوں جو دلوں میں ڈوب جانے کے لیے

مفلسی چھانٹے اسے قہر و غضب کے واسطے
جس کا مکھڑا ہو شبستانِ طرب کے واسطے

فرطِ خشکی سے وہ لب ترسیں تکلّم کے لیئے
جن کو قدرت نے تراشا ہو تبسّم کے لیئے

دستِ نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہیے
اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہیے

شوہر کے عارضوں میں یہ افراطِ رنج و غم　　سویا ہوا تھا سازِ جوانی کا زیر و بم
گاتی ہوئی خزاں تھی سسکتی ہوئی بہار

پانی کی ایک بوند سے مرعوب تھا شرر　　حیراں شکوہِ قطرۂ شبنم سے تھا گزر
چھالے کے طمطراق سے لرزاں تھا نیشتر　　ذرّے پہ آفتاب جھکائے ہوئے تھا سر
کم زوریوں کے زور پہ حاصل تھا اقتدار

ٹھنڈی ہوا سے وجد میں تھی روحِ بوستاں　　سرشار ہو چلی تھی زمیں، مست آسماں
زوجہ کے ساتھ ساتھ تھا شوہر رواں دواں　　اک موڑ پر مڑے ہی تھے دونوں کہ ناگہاں
گزری ادھر سے ہو کے اک آئینہ روزگار

اِس طرح جیسے ناؤ کوئی ڈولتی ہوئی　　ابرو کے بل سے دِل کی گرہ کھولتی ہوئی
تلوار سی ہر ایک لچک تولتی ہوئی　　گاتی ہوئی ادائیں نظر بولتی ہوئی
زُلفوں کے پیچ و خم میں لیے موجِ آبشار

شوہر کی اُٹھ کے جم گئی اس شوخ پر نگاہ　　پلکوں نے سسکیاں سی بھریں اور نظر نے آہ
چمکی نگاہِ زوجہ میں شمشیرِ اشتباہ　　پیدا ہوئی وہ آگ کہ اللہ کی پناہ
آفت کی کش مکش تھی قیامت کا خلفشار

رحمت سے آس جیسے گنہ گار توڑ دے　　کوئی بہک کے ساغرِ سرشار توڑ دے
گھبرا کے جیسے دم کوئی بیمار توڑ دے　　جس طرح کوئی جنگ میں تلوار توڑ دے
شوہر نے یوں جھکائی کمر ہو کے شرمسار

اتنا ڈرا غریب کہ تپنے لگا جگر　　بیگانہ وار آنکھ اُٹھائی اِدھر اُدھر
گردن ہلائی بیوی نے غصّے سے دیکھ کر　　یعنی متاعِ زوجہ نے شوہر کے حلق پر
سونے کی بڑھ کے پھیر دی شمشیرِ آب دار

بھٹکی ہوئی نیکی

ہر شے کو مسلسل جنبش ہے راحت کا جہاں میں نام نہیں
اس عالمِ سعی و کاوش میں دم بھر بھی ہمیں آرام نہیں
چھائی ہے فضا پر تشنہ لبی مفقود یہاں سیرابی ہے
ہر جسم میں اک بے چینی ہے ہر روح میں اک بے تابی ہے
اِس بزمِ خلش کا ہر ذرّہ بے چینیوں کے انبوہ میں ہے
اک رعشۂ پیہم کاہ میں ہے اک لرزشِ پنہاں کوہ میں ہے
لیلائے سماعت مضطر ہے عشرت کے ترانے سُننے کو
ہر نقص کا دامن پھیلا ہے تکمیل کی کلیاں چننے کو
ہیجان ہے چشمِ پستی میں رفعت کا نوشتہ پڑھنے کا
ایک دُھن ہے ترقی کرنے کی اک جوش ہے آگے بڑھنے کا
ہر موم کو دُھن ہے شمع بنے مضطر ہے پگھل جانے کے لئے
ہر سنگ کا سینہ جلتا ہے آتش میں بدل جانے کے لئے
انگاروں پہ شعلے لوٹتے ہیں بجلی پہ تفوق پانے کو
چنگاریاں مرغِ بسمل ہیں تاروں کی جگہ کھل جانے کو
بے چین بگولہ رقصاں ہے آندھی پہ شرف پانے کے لیے
جو موج ہے پیچ و تاب میں ہے دھارے سے اُلجھ جانے کے لئے
ہر قطرۂ دریا غلطاں ہے موتی پہ تسلّط پانے کو
ہر ذرّۂ خاکی اُڑتا ہے خورشید سے ٹکر کھانے کو
ہر دل میں غرض اِک کاہش ہے اُمید کا ساغر بھرنے کی

ہر شے کی تڑپتی فطرت میں خواہش ہے ترقی کرنے کی
وہ چور جو شب کے پردے میں سرقے کی غرض سے آتا ہے
جو نیند کی ماتی بستی پر ظلمت کی طرح چھا جاتا ہے
اک ایسی ہی خواہش اس کو بھی چوری کے لئے اُکساتی ہے
جس طرح کی خواہش نورانی دیوتاؤں میں پائی جاتی ہے
سارق بھی فرشتوں ہی کی طرح لیکن وہ طرب کا جویا ہے
ہر چند کہ اس نے قسمت سے تسکین کا رستہ کھویا ہے
رہبر ہو کہ رہزن دونوں میں تسکین کی خواہش یکساں ہے
ہر چند وہ سیدھی راہ پہ ہے یہ راہ بھٹک کر حیراں ہے
عارف نے یہ سمجھا آسائش اشکوں کو گرا کے ملتی ہے
قاتل نے یہ سمجھا انساں کا وہ خون بہا کر ملتی ہے
صوفی نے یہ سمجھا وہ دل کے پیمانے میں مل جائے گی
مےکش کی سمجھ میں یہ آیا مےخانے میں مل جائے گی
پس ذوقِ طرب میں جو انساں رہتا ہے سدا مےخانوں میں
ہے اصل میں وہ بھی دنیا کے معصوم ترین انسانوں میں
جال اس پہ نہ ڈال اے صید افگن یہ بامِ حرم کا طائر ہے
آیا ہے بھٹک کر دیر میں جو گم راہ نہیں ہے زائر ہے
جتنے بھی زمیں پر مجرم ہیں خواہش ہی کے زیرِ فرماں ہیں
ہر جرم سیہ کے محضر پر خواہش ہی کی مہریں تاباں ہیں
الغرض ان تشریحوں سے ہم پر یہ حقیقت کھلتی ہے
کہتے ہیں جسے دنیا میں بدی بھٹکی ہوئی وہ اک نیکی ہے

بدلی کا چاند

خورشید وہ دیکھو ڈوب گیا ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب وہ ہلکے بادل سے چاندی کے ورق برسانے لگا
لو ڈوب گیا پھر بادل میں، بادل میں وہ خط سے دوڑ گئے
لو پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں ظلمت کا قدم تھرّانے لگا
بادل میں چھپا تو کھول دیے بادل میں دریچے ہیرے کے
گردوں پہ جو آیا تو گردوں دریا کی طرح لہرانے لگا
سمٹی جو گھٹا تاریکی میں چاندی کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہوا تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا
غرفوں سے جو جھانکا گردوں کے امواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل کے کہسار کا سر چکرانے لگا
پردہ جو اُٹھایا بادل کا دریا پہ تبسّم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی میدان کا دل گھبرانے لگا
اُبھرا تو تجلّی دوڑ گئی ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
اُلجھا تو سیاہی دوڑا دی سُلجھا تو ضیا برسانے لگا
کیا کاوشِ نور و ظلمت ہی کیا قید ہی کیا آزادی ہی
انسان کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

گرمی اور دیہاتی بازار

دوپہر، بازار کا دن گانوں کی خلقت کا شور

خون کی پیاسی شعاعیں روح فرسا لو کا زور
آگ کی رو کاروبارِ زندگی کا پیچ و تاب
تُند شعلے، سُرخ ذرّے، گرم جھونکے، آفتاب
شور، ہلچل، غلغلہ، ہیجان، لو، گرمی، غبار
بیل، گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں قطار اندر قطار
مکھیوں کی بھنبھناہٹ، گُڑ کی بو، مرچوں کی دھانس
خربزے، آلو، کھلی، گیہوں، کدو، تربوز، گھاس
دھوپ کی شدّت، ہوا کی یورشیں، گرمی کی رو
کملیوں پر سُرخ چاول ٹاٹ کے ٹکڑوں پہ جو
گرم ذرّوں کے شدائد، جھکّڑوں کی سختیاں
جھکّڑوں میں کھانستے بوڑھوں کی چلموں کا دھواں
مرد و زن گردش میں حیلوں کی صدا سنتے ہوئے
چلچلاتی دھوپ کی رو میں چنے بھُنتے ہوئے
میان سے موسم کی تیغِ بے اماں نکلی ہوئی
پیاس سے انسان و حیواں کی زباں نکلی ہوئی
آسماں پر ابر کے بھٹکے ہوئے ٹکڑوں کا رم
نشے میں ممسک کا جیسے وعدۂ جود و کرم
ہر روش پر چڑ چڑا پن ہر صدا میں بے رُخی
ہر جگہ چھلکتا ہوا ہر کھوپڑی پکتی ہوئی
سر پہ کافر دھوپ جیسے روح پر عکسِ گناہ
تیز کرنیں جیسے بوڑھے سود خواروں کی نگاہ

کوہستانِ دکن کی عورت

یہ اُبلتی عورتیں اس چلچلاتی دھوپ میں
سنگ اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں

واہ کیا کہنا ترا ای حسنِ ارضِ آفتاب
یہ برشتہ رنگ یہ تپتے ہوئے رنگیں شباب

ہر سراپا بت تراشوں کی عرق ریزی کا پھل
اتنی بے پایاں صلابت پر بھی ہر نقشہ سجل

چال جیسے تند چشمے تیوریاں جیسے غزال
عارضوں میں جامنوں کا رنگ آنکھیں بے مثال

عورتیں ہیں یا کہ ہیں برسات کی راتوں کے خواب
پھٹ پڑا ہی جن پہ طوفاں خیز پتھریلا شباب

یہ جواں چہرے یہ ان چہروں میں برنائی کا جوش
تو کہے آہن میں کھودے ہیں کسی نے چشم و گوش

جسم ہیں کچھ اس قدر ٹھوس الحفیظ و الاماں
لیجیے چٹکی تو چھل جائیں خود اپنی انگلیاں

پھلیاں شانوں کی اُبھری سی ہٹی سی کاکلیں
آہن و فولاد کے پٹھے سلاخوں کی رگیں

دید کے قابل ہیں ان کافر بتوں کا رنگ روپ
کھپ چکی ہی جن میں بارش ڈس چکی ہی جن کو دھوپ

ان بنات کوہ کی کڑیل جوانی الاماں

پتھروں کا دُودھ پی پی کر ہوئی ہی جو جواں
کنکروں کے فرش پر دُنیا سلاتی ہی جنھیں

آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہی جنھیں
کیا خبر کتنے دلوں کو جوش پامالی ہوئی
ان اداؤں سے کہ طوفانوں کی ہیں پالی ہوئی

ظلمتیں

تیرگی لپٹی ہوئی ہی دہر میں ہر ضو کے ساتھ
عربدہ کرتا ہی یاں ہر راستہ رہرو کے ساتھ
لعل شیریں کے تبسّم میں ہی غلطاں آہ سرد
ظلمتوں کی رَو بھی ہی قندیل زر کی لو کے ساتھ
ہم نفس با ایں ہمہ برنائی و افسوں گری
بیوگی کا دبدبہ بھی ہی عروس نو کے ساتھ
اس قدر بھی ناز فرماتا ہی کوئی اے چمن
دھوپ بھی ہی ابرِ رنگا رنگ کے پرتو کے ساتھ
انجمن میں رات کو چپکے سے پا جاتا ہی بار
فتنۂ ظلمت نشاں بھی روشنی کی رو کے ساتھ
ڈوب جاتا ہی تڑپ کر سینۂ دریا میں جوش
سوزِ پیچ و تاب بھی تنویرِ ماہِ نو کے ساتھ

پیٹ بڑا بدکار ہی بابا
پیٹ بڑا بدکار
ناداں بیٹھے کشتی پر اور دانا غوطے کھائے
کتّا سوئے گدّے پر اور ٹھلے چوکیدار
پیٹ بڑا بدکار ہی بابا
پیٹ بڑا بدکار
کوّوں کو اور راگ سنائے کویل بن کے بیچ
منعم کی اور سیج بسائے مفلس کا دل دار
پیٹ بڑا بدکار ہی بابا
پیٹ بڑا بدکار
آدم کا بانکا بیٹا اور بھڑوے پن کا روپ
حوّا کی سندر بیٹی اور رنڈی کا بیوپار
پیٹ بڑا بدکار ہی بابا
پیٹ بڑا بدکار

البیلی صبح

نظر جھکائے عروسِ فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہی
سحر کا تارا ہی زلزلے میں اُفق کی لو تھرتھرا رہی ہی
روش روش نغمۂ طرب ہی چمن چمن جشنِ رنگ و بو ہی
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں کلی کلی گنگنا رہی ہی

جذبی

موت

اپنی سوئی ہوئی دُنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اک دھوم مچا لوں تو چلوں
اور اک جام مئے تلخ چڑھا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں

جانے کب پی تھی ابھی تک ہے مئے غم کا خمار
دُھندلا دُھندلا نظر آتا ہے جہانِ بیدار
آندھیاں چلتی ہیں دُنیا ہوئی جاتی ہے غبار
آنکھ تو مل لوں۔ ذرا ہوش میں آلوں تو چلوں

وہ مرا سحر وہ اعجاز کہاں ہے لانا
میری کھوئی ہوئی آواز کہاں ہے لانا
میرا ٹوٹا ہوا وہ ساز کہاں ہے لانا
اک ذرا گیت بھی اس ساز پہ گا لوں تو چلوں

میں تھکا ہارا تھا اتنے میں جو آئے بادل
کسی متوالے نے چپکے سے بڑھا دی بوتل
اُف وہ رنگیں پُر اسرار خیالوں کے محل
ایسے دو چار محل اور بنا لوں تو چلوں

مجھ سے کچھ کہنے کو آئی ہے مرے دل کی جلن
کیا کیا میں نے زمانے میں نہیں جس کا چلن
آنسوؤ! تم نے تو بے کار بھگویا دامن
اپنے بھیگے ہوئے دامن کو سکھا لوں تو چلوں

میری آنکھوں میں ابھی تک ہے محبّت کا غرور
میرے ہونٹوں کو ابھی تک ہے صداقت کا غرور
میرے ماتھے پہ ابھی تک ہے شرافت کا غرور
ایسے وہموں سے بھی اب خود کو نکالوں تو چلوں

غزل

مشعل تھے جو بحرِ ظلمت میں وہ ماہ و اختر ٹوٹ گئے
اور لطف یہ ہے ای طوفانو! کشتی کے بھی لنگر ٹوٹ گئے
اک یاس بھرے دل پر نہ ہوئی تاثیر تمھاری نظروں کی
اک موم کے بے حس ٹکڑے پر یہ نازک خنجر ٹوٹ گئے
کیا ماتم ان اُمیدوں کا جو آتے ہی دل میں خاک ہوئیں
کیا روئے فلک ان تاروں پر یہ نازک خنجر ٹوٹ گئے
یا اشکوں کا رونا تھا مجھے یا اکثر روتا رہتا ہوں
یا ایک بھی گوہر پاس نہ تھا یا لاکھوں گوہر ٹوٹ گئے
میری ہی نظر کی مستی سے سب شیشہ و ساغر رقصاں تھے
میری ہی نظر کی گرمی سے سب شیشہ و ساغر ٹوٹ گئے

یہ عرشِ محبت ہی میرا اے طائرِ سدرہ ہوش میں آ
اس لاحاصل سی کوشش میں تخیل کے شہپر ٹوٹ گئے
تو اور غمِ اُلفت جذبیؔ مجھ کو تو یقیں آئے نہ کبھی
جس قلب پہ ٹوٹے ہوں پتھر اس قلب میں نشتر ٹوٹ گئے

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دُنیا ہو یا وہ دُنیا اب دُنیا دُنیا کون کرے
جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

ملے غم سے مجھ کو فرصت تو سناؤں وہ فسانہ
کہ ٹپک پڑے نظر سے مئے عشرتِ شبانہ
یہی زندگی مصیبت، یہی زندگی مسرت
یہی زندگی حقیقت، یہی زندگی فسانہ
کبھی درد کی تمنا، کبھی کوششِ مداوا
کبھی بجلیوں کی خواہش، کبھی فکرِ آشیانہ

محمد علی جوہر

غزل

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد — ہے ابتدا ہماری تری اِنتہا کے بعد
جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیری آرزو — باقی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد
تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے و لے — میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
لذّت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں — آتا ہے لُطف جُرمِ تمنّا سزا کے بعد

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اِسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب باتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر آن تسلّی ہے ہر لحظہ تشفّی ہے
ہر وقت ہے دل جوئی ہر دم ہیں مداراتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بیٹھا ہوا توبہ کی توخیر منا یا کر
ٹلتی نہیں یوں جوہر اس دیس کی برساتیں

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی

قیدِ گیسو سے بھلا کون رہے گا آزاد
تیری زلفوں کا جو شانوں پہ بکھرنا ہے یہی

اور کس وضع کی جویاں ہیں عروسانِ بہشت
ہیں کفن سرخ شہیدوں کا سنورنا ہے یہی

حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانے
اب بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے یہی

نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر
کام کرنے کا یہی ہے تمھیں کرنا ہے یہی

دعائے اسیر

(اپنی عزیز بیٹی آمنہ کی علالت پر جس کی اطلاع جیل خانے میں ملی تھی)

میں ہوں مجبور پہ اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

امتحاں سخت سہی پر دلِ مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

ہے دعا اور دوا فرض دے حکمِ خدا
ٹل سکے یہ کسی بندے کا بھی مقدور نہیں

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

تو تو مُردوں کو جلا سکتا ہے قرآں میں کیا
يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ مذکور نہیں

تیری قدرت سے خدایا تری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

یاں بھی ہے یوسف و یعقوب میں زنداں حائل
میں ہوں محصور اگر آپ وہ محصور نہیں

شانِ رحمت مجھے دکھلا کہ ہو تسکیں کا نزول
دلِ جوہر بھی ہے یا رب جبلِ طور نہیں

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خُم کے خُم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

شہد و شرابِ خلد میں یہ چاشنی کہاں   کچھ خونِ دل سے بڑھ کے مزا ہو تو جانیے

آساں نہ تھا تقربِ شیریں تو کیا ہوا   تیشے کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دور

دنیا تھی داد تشنہ لبی یوں حسینؑ کو   کوثر کا اک بہانہ بنی کربلا کے دوست
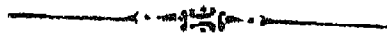
پنڈت برج نراین چکبست لکھنوی

رامائن کا ایک سین

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام ۔۔۔ راہِ وفا کی منزلِ اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام ۔۔۔ دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہارِ بیکسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال ۔۔۔ خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال ۔۔۔ سکتہ سا ہوگیا ہے یہ ہے شدتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ ۔۔۔ نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ ۔۔۔ لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا ۔۔۔ افسانۂ شدائدِ رنج و محن کھلا
اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا ۔۔۔ وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھلا
دردِ دلِ غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں
میں جانتی ہوں جس لیے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
لیکن میں اپنے منہ سے ہرگز کہوں گی ہاں

کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

گوکھلے

وطن کو تو نے سنوارا کس آب و تاب کے ساتھ
سحر کا نور بڑھے جیسے آفتاب کے ساتھ
پچھے رفاہ کے گُل حسنِ انتخاب کے ساتھ
شباب قوم کا چمکا ترے شباب کے ساتھ

جو آج نشو و نما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے

رہا مزاج میں سودائے قوم خو ہو کر
وطن کا عشق رہا دل کی آرزو ہو کر
بدن میں جان رہی وقفِ آبرو ہو کر
رگوں میں جوشِ محبت رہا لہو ہو کر

خدا کے حکم سے جب آب و گِل بنا تیرا
کسی شہید کی مٹی سے دل بنا تیرا

کمالِ بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا
ابھرنے ہی نہیں دیتی یہاں بے مائگی دل کی
نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا
عروسِ جاں نیا پیراہنِ ہستی بدلتی ہے
فقط تمہید آنے کی ہے دنیا سے گزر جانا

دیکھ بڑوں کی ریت نہ جائے　　مر جائے پر میت نہ جائے
میں ڈرتا ہوں کوئی تیری　　جیتی بازی جیت نہ جائے
جو کرنا ہو جلدی کر لے　　تھوڑا وقت ہی بیت نہ جائے
تھوڑا وقت ہی بیت نہ جائے
وقت نہ جائے بیت
لبسالے
اپنے من میں پریت

جاگ سوزِ عشق

جاگ سوزِ عشق جاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ کام دیوتا　　فتنہ ہائے نو جگا
بجھ گیا ہے دل مرا　　پھر کوئی لگن لگا
سرد ہو گئی ہے آگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

پڑ گئی دلوں میں پھوٹ　　کیا بجوگ پڑ گیا
پرتھوی پہ چار کھونٹ　　ایک سوگ پڑ گیا
سرنگوں ہے شبہشتی ناگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

تو نے آنکھ بند کی — کائنات سو گئی
حسن خود پسند کی — دن سے رات ہو گئی
زرد پڑ گیا سہاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

اب نہ وہ سفر نہ سیر — رہبری نہ رہزنی
کچھ نہیں ترے بغیر — دوستی نہ دشمنی
اب لگا دہی نہ لاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

تو جو چشم وا کرے — ہر اُمنگ جاگ اُٹھے
آہ و نالہ جاگ اُٹھے — راگ رنگ جاگ اُٹھے
جوگ سے ملے بہاگ
جاگ سے سوزِ عشق جاگ

فرشتے کا گیت

دیکھ اس دنیا کا نظارہ

ہلکا ہلکا پیارا پیارا
میرے ساز کے تاروں میں   رنگیں نغمہ زاروں میں
نیندوں کے دریاؤں میں ہے ایک خیالی دُنیا   اس دُنیا کو دنیا کہہ دیتی ہو خالی دُنیا
دیکھ اس دُنیا کا نظارہ
ہلکا ہلکا پیارا پیارا
میرے ساز کے تاروں میں   رنگیں نغمہ زاروں میں

ہستی کیا ہے میٹھا سپنا
سپنا کیا ہے میٹھی پریت   میٹھی پریت ہے میرا گیت
میرے میٹھے گیتوں میں بستی ہے ساری ہستی   میٹھے میٹھے گیت ہیں میرے پیاری پیاری ہستی
ہستی کیا ہے میٹھا سپنا
دل میں رہنا آنکھ سے چھپنا
سپنا کیا ہے میٹھی پریت   میٹھی پریت ہے میرا گیت

ریاض خیرآبادی

اتری ہے آسمان سے جو کل اٹھا تو لا
طاقِ حرم سے شیخ وہ بوتل اٹھا تو لا

دھونا ہے داغ جامۂ احرام صبح صبح
حجرے سے شیخ پانی کی بوتل اٹھا تو لا

مجھ کو بھی انتظار تھا ابر آئے تو پیوں
ساقی اگر یہ سچ ہے کہ بادل اٹھا تو لا

طاقِ حرم میں شیخ نکالی ہے پھول بھی
اس کام کا ملے گا تجھے پھل اٹھا تو لا

میں کام لوں گا ابر کا اے رندتان کر
تو مجھ فقیر مست کا کمل اٹھا تو لا

ناصح کا منہ ہو بند چکھا دوں شرابِ خلد
ساقی ذرا ریاض کی بوتل اٹھا تو لا

کچھ آئینے نے اور ہی عالم دکھا دیا
دونوں کو ایک دوسرے نے کیا بنا دیا

دیوانگی نے میری مجھے کیا مزا دیا
ان کو بھی ساتھ میرے تماشا بنا دیا

ننھے سے دل کی چھوٹی سی تربت بنائی تھی
نقشِ قدم نہ تھا جسے تم نے مٹا دیا

کیسے یہ بادہ خوار ہیں سن سن کے پی گئے
واعظ کو کچھ مزا نہ کسی نے چکھا دیا

شوخی سے ہر شگوفے کے ٹکڑے اڑا دیے
جس غنچے پر نگاہ پڑی دل بنا دیا

اس واسطے کہ آئے بھگت ہو کدے میں ہم
پوچھا جو گھر کسی نے تو کعبہ بنا دیا

ہم گزرے جس طرف سے ادھر انگلیاں اٹھیں
دیوانہ ان حسینوں نے ہم کو بنا دیا

پاؤں تو ان حسینوں کا منہ چوم لوں ریاض
آج ان کی گالیوں نے بہت ہی مزا دیا

ڈھل چکی ہے اب جوانی جائے گی — یہ شرابِ ارغوانی جائے گی

بعد توبہ آتشِ سیالِ خُم — میرے گھر سے ہو کے پانی جائے گی

تیغ ہی کیا ہاتھ میں قاتل کے تھی — اے حنا تو بھی تو سانی جائے گی

شوخیاں کہتی ہیں کھل کھیلیں گے وہ — اب حیا کی پاسبانی جائے گی

شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی — مےکدے سے اب پرانی جائے گی

پینے آئیں تو فرشتے حورِ ریاض
حور کے دامن میں چھانی جائے گی

جو ہم آئے تو بوتل کیوں الگ پیرِ مغاں رکھ دی
پرانی دوستی بھی طاق پر اے مہرباں رکھ دی

خدا کے ہاتھ ہے بکنا نہ بکنا مے کا اے ساقی
برابر مسجدِ جامع کے ہم نے اب دکاں رکھ دی

چمن کا لطف آتا ہے مجھے صیاد کے صدقے
قفس میں لا کے اُس نے آج شاخِ آشیاں رکھ دی

بنا ہے ایک ہی دونوں کی کعبہ ہو کہ بُت خانہ
اُٹھا کر خشتِ خُم ہم نے وہاں رکھ دی یہاں رکھ دی

یہ قیس و کوہکن کے سے فسانے بن گئے کتنے
کسی نے ٹکڑے کر کے سب ہماری داستاں رکھ دی

یہ عالم ہو رہا ہے میں ایک ایک قطرے کو ترستا ہوں
حرم میں اب خدا جانے بھری بوتل کہاں رکھ دی

زمینِ میکدہ عرشِ بریں معلوم ہوتی ہے
یہ خشتِ خم فرشتے کی جبیں معلوم ہوتی ہے

شفق کہے کوئی چاہے شفق گوں آسماں کہے
ہمیں تو کوئے قاتل کی جبیں معلوم ہوتی ہے

ارے ساقی ذرا میری شرابِ تلخ تو لانا
مئے کوثر تو بالکل انگبیں معلوم ہوتی ہے

یہ اے صیاد رہ رہ کر چمکتی ہے کہاں بجلی
جہاں میرا نشیمن تھا وہیں معلوم ہوتی ہے

ریاض ایسی مرے دل سے لگی ہے جامِ کوثر کی
مئے انگور اب اچھی نہیں معلوم ہوتی ہے

ہمارے دل میں ہے جو داغ ایسا کم نکلتا ہے
یہ بن بن کر چراغِ محفلِ ماتم نکلتا ہے

ترے ٹھوکر کے فتنے کو نہ ایسا ہم سمجھتے تھے
یہ ظالم تو قیامت سے قدِ آدم نکلتا ہے

بجائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشتِ خم رکھ دیں
جہاں ساغر ٹپک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے

مجھے آنے سے کیوں روکیں مجھی سے ہے یہ بزمِ ساقی میں
یہ کیا ہے بعد مدت کیوں یہ جامِ جم نکلتا ہے

تمہیں کیوں کر بتا دوں کیا مرے دل پر گزرتا ہے
تمھیں کیوں کر دکھا دوں تم میں کیا عالم نکلتا ہے

یہاں رونا پڑا دو دو کا ہے آئیں نہ سینے میں
سسکتی ہے تمنا، آرزو کا دم نکلتا ہے

سحر ہوتے وہ اپنا چاکِ دامن لے کے بیٹھے ہیں
رفو کرنے کو تارِ دامنِ مریم نکلتا ہے

ریاض ایسا گیا گزرا نہیں جو شان جان دے
گدائی کے لیے وہ لے کے جامِ جم نکلتا ہے

روزہ رکھ کر بلا کے دن کاٹے ہیں
مے سے دامن بچا کے دن کاٹے ہیں

میخانے میں ہم تشنہ لبوں نے ساقی
سینے سے سبو لگا کے دن کاٹے ہیں

روشؔ صدیقی

ساقی

دیکھ وہ عرش سے نازل ہوتی شام اے ساقی
ہو اب اک لمحہ بھی تاخیر حرام اے ساقی

زندگی ہی شبِ تاریک نہ ہو جائے کہیں
لا مہ و مہر سے ترشا ہوا جام اے ساقی

تیری صہبا خم و مینا و سبو توڑ گئی
کہ یہ شمشیر تھی بیزارِ نیام اے ساقی

اب تری نرگسِ مخمور کا ایما کیا ہے
آج تو بزم میں بھی ہے لغزشِ عام اے ساقی

اب وہ مے دے کہ جو ہو شگفت افروزِ خودی
سخت برہم ہے زمانے کا نظام اے ساقی

جس نے صدیوں سے نہ دیکھا تھا کبھی روزِ غریب
اب وہ خورشیدِ خرد ہے لبِ بام اے ساقی

علمِ موجود کے ایوان کا اب حال یہ ہے
جیسے طوفاں میں کوئی کشتیٔ خام اے ساقی

ٹھوکروں میں ہے سرِ پندارِ خرد بھی پامال
رقصِ تخریب ہے آزادِ زمام اے ساقی

جس نے کاشانۂ انساں کو کیا تھا ویراں
اب وہ تہذیب ہے ویرانِ دوام اے ساقی

جس نے صہبائے محبت کو کیا زہر آلود
آج اس زہر سے ہے مرگ بجام اے ساقی

جو غمِ عشق کی عظمت کو سمجھتا تھا حرام
اس پہ ہر لمحۂ راحت ہے حرام اے ساقی

ماجرا ذلتِ تہذیبِ تمدن کا نہ پوچھ
جیسے رسوا کوئی نالورۂ بام اے ساقی

آگ اور خون کے طوفاں ہیں پراگندہ نقاب
آج بے پردہ ہے دوزخ کا مقام اے ساقی

خود کہے دیتی ہے خاکستر تہذیب فرنگ کون تھا سوختۂ آتش خام اے ساقی
گر یہی ہوش پرستی کی سزا کا آغاز کیا ہو اب دیکھیے یا دانش تمام اے ساقی
علم کہتا ہے جسے قاصدِ اقلیمِ فنا زلف بردوش ہے وہ ظلمت عام اے ساقی

اب ترے در پہ زمانہ ہے طلبگار سکوں کہ یہی در تو ہے محبوب انام اے ساقی
یہیں ملتی ہے محبت کی ہواؤں کو حیات لمحہ لمحہ ہے یہاں خلد مشام اے ساقی
داغ غم تیرے سوا کون مٹا سکتا ہے مہر تاباں نہ کوئی ماہ تمام اے ساقی
تیرے میخانے سے اٹھتی ہوئی ایک ایک کرن ہے سکونِ دلِ انساں کا پیام اے ساقی

عام ہے اسود و احمر پہ ترا جود و کرم سب کی دولت ہے تری رحمت عام اے ساقی
کچھ یہاں مشرق و مغرب کی نہیں ہے تخصیص سب کو ملتا ہے ترے ہاتھ سے جام اے ساقی
تو نے علم و عمل و عشق کو بخشا وہ سرور کہ جو ہے عرش پہ مصروف خرام اے ساقی
جس سے مستی بھی ہے سرشار، فنا بھی مدہوش تیری صہبا میں ہے وہ کیف تمام اے ساقی

روشنی

دیکھ کر دیدۂ گیتی میں فروغِ امید
مطمئن ہوں کہ بہت جلد وہ دور آئے گا

جسے گردوں نے ستاروں میں چھپا رکھا ہے
کہکشاں نے جسے اک راز بنا رکھا ہے
قدسیوں نے جسے انساں سے چھپا رکھا ہے

ختم ہونے کو ہے افسانۂ محرومیٔ دید
اب یہ پردہ رخِ امکاں سے سرک جائے گا

ہاں وہی دور وہی عہدِ مسرت بنیاد
جس کو روحِ غمِ پنہاں نے کیا ہو تعمیر

وہی عالم وہی مسجودِ جبینِ ایام
وہی آغاز کہ جس کا نہیں کوئی انجام
وہی جنت وہی کیفِ ابدی کا پیغام
چشمِ آدم میں جو تھا صبحِ ازل سے آباد
مسکراتا ہے وہی خواب بہ شکلِ تعبیر

یہ سکوں اور یہ شب ہائے غلامی کا فسوں
زورِ طوفانِ تغیر سے بکھر جائے گا

وقت توڑے گا روایات کے بت خانوں کو
غرق کر دے گا کمالات کے ایوانوں کو
پھونک دے گا درِ ظلمت کے نگہبانوں کو

ہے یہ مژدہ کہ یہیں معرکۂ آتش و خوں
چہرۂ عالمِ ایجاد نکھر جائے گا

جب تصور یہ غلامانِ خرد تھے مغرور
وہ جہاں سوز تصور ہے چراغِ سحری

اب گریبانِ تمدن میں رفو نا ممکن
تنِ بے روح میں تجدیدِ نمو نا ممکن
رنگ لائے نہ صداقت کا لہو نا ممکن

جلوہ گر لوحِ تعبیر پہ ہے یہ آیت نور
کہ گرا چاہتا ہے خیمۂ بیدادگری

خوش ہو اے دوست کہ وہ دورِ بہار آتا ہے
جس کو نزدیکِ خزاں کر نہ سکے گا انساں

شکلِ نفرت نہ جہاں میں نظر آئے گی کبھی
موجِ بیگانہ دشی سر نہ اٹھائے گی کبھی
غیرت آکے بہیں منہ نہ دکھائے گی کبھی

اب زمیں پر درِ یزداں سے وہ پیار آتا ہے
کہ جسے نذرِ زیاں کر نہ سکے گا انساں

ن۔ م۔ راشد

بے کراں رات کے سناٹے میں

تیرے بستر پہ مری جان کبھی
بے کراں رات کے سناٹے میں
جذبۂ شوق سے ہو جاتے ہیں اعضا مدہوش
اور لذت کی گرانباری سے
ذہن بن جاتا ہے دلدل کسی ویرانے کی
اور کہیں اس کے قریب
نیند آغازِ زمستاں کے پرندے کی طرح
خوف دل میں کسی موہوم شکاری کا لیے
اپنے پر تولتی ہے چیختی ہے
بے کراں رات کے سناٹے میں
تیرے بستر پہ مری جان کبھی
آرزوئیں ترے سینے کے کہستانوں میں
ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں

ایک لمحے کے لیے دل میں خیال آتا ہے
تو مری جاں نہیں

بلکہ ساحل سے کسی شہر کی دوشیزہ کے
اور ترے ملک کے دشمن کا سپاہی ہوں میں
ایک مدت سے جسے ایسی کوئی شب نہ ملی
کہ ذرا روح کو اپنی وہ سبک بار کرے
بے پناہ عیش کے ہیجان کا ارمان لے کر
اپنے دستے سے کئی روز سے مفرور ہوں میں
تیرے بستر پہ مری جان کبھی
بے کراں رات کے سناٹے میں

شرابی

آج پھر بھی پھر کے پی آیا ہوں میں
دیکھتے ہی تیری آنکھیں شعلہ ساماں ہو گئیں
شکر کر اے جان کہ میں
ہوں در افرنگ کا ادنیٰ غلام
صدر اعظم یعنی دریوزہ گر اعظم نہیں
ورنہ اک جام شراب ارغواں
کیا بجھا سکتا تھا میرے سینۂ سوزاں کی آگ
غم سے مرجاتی نہ تو
آج پی آتا جو میں
جام رنگیں کے بجائے

بے کسوں اور ناتوانوں کا لہو
شکر کر اے جانِ کہ میں
ہوں درِ افرنگ کا ادنیٰ غلام
اور بہتر عیش کے قابل نہیں

زنجیر

گوشۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش ہویدا ہو چلی
سنگِ خارا ہی سہی خارِ مغیلاں ہی سہی
دشمنِ جاں دشمنِ جاں ہی سہی
دوست سے دست و گریباں ہی سہی
یہ بھی تو شبنم نہیں
یہ بھی تو مخمل نہیں، دیبا نہیں، ریشم نہیں

ہر جگہ پھر سینۂ نخچیر میں
ایک نیا ارماں نئی اُمید پیدا ہو چلی
حجلۂ سیمیں سے تو بھی پیلۂ ریشم نکل
وہ حسیں اور دور افتادہ فرنگی عورتیں
تو نے جن کے حسن روز افزوں کی زینت کے لئے
سالہا بے دست و پا ہو کر بنے ہیں تار ہائے سیم و زر

اُن کے پردوں کے لیے بھی آج اک سنگیں چال
ہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال

شکرہے دنبالۂ زنجیر میں
ایک نئی جنبش، نئی لرزش ہویدا ہو چلی
کوہساروں، ریگزاروں سے ندا آنے لگی
ظلم پروردہ غلامو بھاگ جاؤ
پردۂ شب گیر میں اپنے سلاسل توڑ کر
چار سو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ
اور اس ہنگام بار آور کو
حیلۂ شب خوں بناؤ

زرخش

سپاس نامۂ اُردو

(بہ حضور اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع خسروِ دکن)

میں شانہ سے در گزری آئینے سے باز آئی
اب دل نہیں ہے جس میں ہو ذوقِ خود آرائی

ہر چند کہ صورت میں ہوں نور کی مورت میں
ناظر نہ ہو جب کوئی کس کام کی رعنائی

اک چاند ہوں بدلی میں اک لعل ہوں گدڑی میں
اک حسن ہوں دیہاتی اک پھول ہوں صحرائی

ہوں بزمِ حریفاں میں جوں آئینہ حیراں میں
با ایں ہمہ زیبائی با ایں ہمہ رعنائی

اس دُھن میں کہ ہاتھ آئے دامن کسی کامل کا
اس دُھن میں کہ ہو جائے شاید کہیں شنوائی

ہر منہ میں زباں ہو کر میں چلتی رہی برسوں
کُل ہند کی وسعت میں کی بادیہ پیمائی

آخر درِ محسن تک قسمت مجھے لے آئی
ہاں تجھ کو بشارت ہو اے ذوقِ جبیں سائی

جاں از سرِ نو بخشی میرے تنِ مردہ میں
پھر زندہ کیا اس نے اعجازِ مسیحائی

قاصد ہوں اک اُردو کی اے شاہ نہیں مجھ کو
دعوائے زباں دانی مشقِ سخن آرائی

تحفۂ درویش

بحرِ غم میں ہے سخت طغیانی
سر سے اوپر گزر گیا پانی

کب تک ای نزہتِ برفتہ جگر — شورِ "یارب" سے عرش جنبانی

رونے دھونے سے جان کھونے سے — کہیں بنتے ہیں کام دیوانی

دردِ دل دردآفریں کو سُنا — کر گزرجی میں ہے جو کچھ ٹھانی

وحشتِ وحدت ہے دشتِ وحدت ہے — دیکھ آہستہ کر فرس رانی

بے خبر پہلے نقش کر دل پر — عظمتِ بارگاہِ یزدانی

مایۂ اشک یاں بضاعتِ مور — ہیچ واں شوکتِ سلیمانی

پہلے دے صدقہ ماسوی اللہ کا — پہلے کر جان و دل کی قربانی

چاہیے بہرِ نذرِ جنسِ گراں — چاہیے خون کو بسدّ افشانی

صدفِ فکر سے نکال گہر — تر بتر کر عرق سے پیشانی

نزہتِ بے نوا سے ہدیہ بدست — ہو قبولِ جنابِ سلطانی

ہدیہ کیا، ایک سادہ دفتر پر — لکھ کے لائی ہوں "لفظا" لاثانی"

دیں ہے الفت وطن فغانستاں

عرف مجنوں ہے پیشہ حسانی

وحیدالدین سلیم

آریوں کی پہلی آمد ہندستان میں

(۱)

وہ دیکھ، کہ موجیں رقص کناں ہیں سطحِ زمیں پر گنگا کی
نو وارد آریہ حیرت میں ہیں دیکھ کے شان اس دریا کی
گنگوتری سے آتی ہے چلی، اٹھکھیلیاں کرتی دھار اس کی
آزادی ہے تیور سے عیاں، متوالی ہے رفتار اس کی

(۲)

اُتر کی طرف جب اُٹھتی ہے، اس قافلۂ مغرب کی نظر
پڑتی ہوئی کرنیں سورج کی ہیں دیکھتے برف کے تودوں پر
پر قلّۂ کوہ ہمالیہ پر عظمت سے ہیں بادل چھائے ہوئے
سینوں کو ہیں تانے دیو کھڑے، امبر سے سروں کو ملائے ہوئے

(۳)

برگد کے درختوں سے جنگل پھیلے ہیں پہاڑ کے دامن میں
شاخیں ہیں جو اُن کی سایہ فگن، ظلمت کا سماں ہے ہر بن میں
پھرتے ہیں وہ فیلِ مست یہاں، ہے دیو کا جن کے قدّ یہ گماں
یہ کالی گھٹا جب دوڑتی ہے، آتا ہے نظر ہیبت کا سماں

(۴)

ہیں رنگ برنگ سے پھول کھلے، زینت ہی چمن کی شباب اُن کا
کھولا ہے نسیم سحر نے ابھی، کس شان سے بند نقاب اُن کا
آئے ہیں مسافر ہند میں جو خیبر کے دروں سے اُتر کے ابھی
دیکھے تھے اُنھوں نے لالہ و گل پامیر کی وادی میں نہ کبھی

(۵)

طائر ہی یہاں پیدا ہیں کیے قدرت نے عجب گل رنگ حسیں
گر زمزمے اُن کے رشی سن لیں، یاد آئے انہیں فردوس بریں
اندر کے اکھاڑے کی پریاں، گاتی ہیں جو دلکش راگنیاں
یہ لوچ سروں میں اُن کے نہیں یہ سوز گلوں میں اُن کے کہاں

(۶)

سورج کی چمکتی ہوئی کرنیں، ہیں چھیڑتی ٹھنڈی ہواؤں کو
بھر دیتی ہیں نور و حرارت سے، باغوں کو اور ان کی فضاؤں کو
سوتی ہوئی سوتیں چشموں کی، اٹھتی ہیں سب آنکھیں مل مل کر
دھاریں ہیں جو برف کے پانی کی، آتی ہیں پہاڑوں سے چل کر

(۷)

اے آریو، آؤ قدم رکھو، ان حسن بھرے گلزاروں میں
جنت کے مزے لوٹو گے سدا، اس پاک زمیں کی بہاروں میں
تم گنگ و جمن کے کناروں پر، شہر اپنے نئے آباد کرو
گا گا کے بھجن، کر کر کے ہون، ہو جاؤ مگن دل شاد کرو

حُسن کی زبان سے

جہاں میں ہے ضیا مری، میں حُسن جلوہ کار ہوں
میں رونقِ اس چمن کی ہوں، میں فصلِ نوبہار ہوں
میں زیبِ کائنات ہوں، میں فخرِ روزگار ہوں
میں شاہدِ شگفتہ کا جمال آشکار ہوں
کہ آئینے میں دہر کے میں عکسِ کردگار ہوں

(۲)

کلیم کو نہ اپنا رُخ میں بے خطر دکھا سکا
سراغ میرے نور کا نہ کوہِ طور پا سکا
نہ میں نظر میں آ سکا، نہ عقل میں سما سکا
خیال میرے اوج پر، نہ پر لگا کے جا سکا
میں حصنِ بے شکست ہوں، میں رہِ ناگزار ہوں

(۳)

پڑی ہے اک خفیف سی نجوم پہ کرن مری
کہ رکھتی ہے طراوت میں سدا انھیں لگن مری
چھپی حجابِ قدس میں ہے شمعِ انجمن مری
ستارے جل کے خاک ہوں، جو دیکھ لیں پھبن مری
میں گنجِ آب و تاب ہوں، میں بحرِ نور زا ہوں

(۴)

یہ چاندنی کی ٹھنڈکیں، یہ دھوپ کی حرارتیں

یہ صبح کی صباحتیں، یہ شام کی ملاحتیں
زمین کی یہ زینتیں، فلک کی یہ لطافتیں
یہ بجلیوں کی شوخیاں، یہ بادلوں کی رنگتیں
یہ رنگ روپ ہیں مرے، میں ان میں آشکار ہوں

(۵)

ہر ایک شاخسار میں مجھی سے آب و رنگ ہے
پھیلتے ہیں درخت جو، یہ میری ہی امنگ ہے
پھدکتے ہیں پرند سب، مجھی سے یہ ترنگ ہے
کرشمے دیکھ کر مرے، ہر ایک عقل دنگ ہے
ہیں کھیل نت نئے مرے، میں وہ طلسم کار ہوں

(۶)

گلوں کے رنگ رنگ سے، عیاں ہیں جھلکیاں مری
چمن کے غنچے غنچے میں شمیم ہے نہاں مری
زباں پہ پتے پتے کی رواں ہے داستاں مری
ہر ایک پودے کی جڑوں میں ہے دواں مری
میں روحِ سبزہ زار ہوں، میں غازۂ بہار ہوں

زندگی

ذرّے ذرّے میں دواں، روحِ رواں پاتا ہوں میں
زندگی کو ایک بحرِ بے کراں پاتا ہوں میں

غنچہ غنچہ نطق پر آمادہ آتا ہے نظر
پتّے پتّے کی زباں کو نغمہ خواں پاتا ہوں میں

زندہ ہستی کی خبر دیتی ہے رفتارِ نفس
بوئے گل کو زندگی کا ترجمان پاتا ہوں میں

برق کی جنبش ہو یا بادِ صبا کا ہو خرام
زندگی کا ہر تموّج میں نشاں پاتا ہوں میں

چپّہ چپّہ اس مکاں کا ہے مکینوں سے بھرا
زندگی کوشش جہت میں حکمراں پاتا ہوں میں

اس سے آگے بھی ہیں روحیں اڑتی پھرتی بے شمار
طائرہ سدرہ کا جس جا آشیاں پاتا ہوں میں

ہو چکی ہے حکمراں جس نخل پر بادِ خزاں
اس کی رگ رگ میں بہارِ بے خزاں پاتا ہوں میں

چارسو بادِ سفر پر دوڑتی ہے جب نظر
زندگی کو کارواں در کارواں پاتا ہوں میں

جانے والوں کی تباہی کے نشانوں میں نہاں
آنے والی ہستیوں کی بستیاں پاتا ہوں میں

الغرض سمجھے ہو جن کو موت کی بربادیاں
زندگی کے انقلاب اُن میں نہاں پاتا ہوں میں

دعوتِ انقلاب

کیا ملے گا خاکِ مردہ و افتادہ بن کے تو   طوفان بن کہ ہے تری فطرت میں انقلاب

کیوں ٹمٹمائے کرمکِ شب تاب کی طرح
بن سکتا ہے تو اوجِ فلک پر اگر شہاب

وہ خاک ہو کہ جس میں ملیں ریزہ ہائے زر
وہ سنگ بن کہ جس سے نکلتے ہیں لعلِ ناب

چڑیوں کی طرح دانے پہ گرتا ہے کس لیے
پرواز رکھ بلند کہ تو بن سکے عقاب

وہ چشمہ بن کہ جس سے ہوں سرسبز کھیتیاں
رہ رو کو تو فریب نہ دے صورتِ سراب

دُرگا سہائے سرور جہاں آبادی

"لکشمی جی"

سبھ مہورت وہ عجب تھی وہ عجب سبھ تھی لگن
کہ جب آکاش سے اترا تھا ترا سنگھا سن

نظر آئی تری صورت میں عجب حُسن کی جوت
تو نے دیوی ہمیں اپنے جو دکھائے درشن

اک چکا چوند کا عالم دمِ نظارہ تھا
گورا گورا تنِ نازک سراپا کندن

شعلۂ حُسن دل افروز بھڑک اٹھتا تھا
رُخِ روشن پہ جو پڑ جاتی تھی سورج کی کرن

تھی چمک آہ ترے چاند سے رخساروں کی
کسی مندر میں تھے یا گھی کے دیے دو روشن

ترچھی بانکی وہ کمانیں تھیں کہ تھی دونوں بھویں
لیے پھرتے تھے کبھی من میں جنھیں رام و لکھن

رُخِ تاباں پہ برستا تھا ترے نورِ ازل
بن کے ساون کی جھڑی اور کبھی بھادوں کی جھڑن

کوکلا سی وہ تری ہائے سریلی آواز
میٹھے میٹھے ترے ڈوبے ہوئے امرت میں بچن

گوری گوری تھی جبیں برج کی سندر کوئی نار
زلف تھی یا کوئی متھرا کی سکھی شام برن

خوشنما کانوں میں کنڈل تھے تو ہاتھوں میں کنگل
اوڑھنی ہلکی سی ریشم کی تھی اک زیبِ بدن

تو اس انداز و ادا سے جو زمیں پر اتری
دیکھنے والوں نے جھک جھک کے لیے تیرے چرن

اہلِ نظارہ سے تصویر تری بول اٹھی
لکشمی ہوں تمھیں دینے کو میں آئی درشن

دلِ بے قرار سو جا

کسی مستِ ناز کا ہے عبث انتظار سو جا
کہ گزر گئی شب آدھی دلِ بے قرار سو جا

یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے
تجھے دے رہے ہیں لوری مرے غم گسار سو جا

یہ تری صدائے نالہ مجھے متہم نہ کردے
مرے پردہ دار سو جا مرے راز دار سو جا

ابھی وہاں پان ہی تو نہیں عاشقی کے قابل
یہ تپش کا آہ شیوہ نہ کر اختیار سو جا

نہ تڑپ زمیں پہ ظالم تجھے گود میں اٹھالوں
تجھے سینے سے لگالوں تجھے کرلوں پیار سو جا

تجھے جن کا ہے تصور رہے مست جام الفت
انھی انکھڑیوں کے صدقے مرے بادہ خوار سو جا

تجھے پہلا سابقہ ہے شب غم بری بلا ہے
کہیں مر مٹے نہ ظالم دل بے قرار سو جا

بھونرے کی بے قراری

نہ وہ کیتکی کی پھبن رہی
نہ وہ موتیا کی ادا رہی

نہ وہ نسترن کی سمن رہی
نہ وہ گل رہے نہ فضا رہی

نہ گلوں کے اب ہیں وہ قہقہے
نہ وہ بلبلوں کے ہیں چہچہے

نہ غزل سرا وہ کوئی رہے
نہ وہ قمریوں کی صدا رہی

نہ وہ سرو ہے نہ وہ آب جو
نہ وہ ہم سفیر ہیں خوش گلو

نہ شگفتہ ہے نہ وہ تازہ بو
نہ وہ جعفری نہ حنا رہی

نہ وہ صبح کی ہیں تجلیاں
نہ شفق کی آہ! وہ جھلکیاں

نہ وہ اودی اودی ہیں بدلیاں
نہ وہ بھینی بھینی ہوا رہی

نہ امنگیں ہیں وہ شباب کی
نہ وہ پتیاں ہیں گلاب کی

نہ ہوا میں بو ہے شراب کی
مجھے مست تھی جو بنا رہی

وہ کنول غضب کے تھے دل ربا
وہ جو اڑتے تھے مرے ہم نوا

مگر اب نہ ان کی ہے وہ ادا — نہ وہ بُو رہی نہ صفا رہی
لب آب جو تھی فضا غضب — وہ بہار کی تھی ہوا عجب
مرے کنج میں مجھے روز و شب — مئے بے خودی تھی پلا رہی
وہ غضب کی کوکو وہ زمزمہ — وہ سریلی درد بھری صدا
سر شام سرو پہ فاختہ — مجھے لوریاں تھی سنا رہی
ہیں کنول کی خشک جو پتیاں — مری خوابگہ تھی کبھی یہاں
یہیں شب کو دیتے تھے تھپکیاں — تھی نسیم مجھ کو سلا رہی
یہاں ننھی جوہی کی اک کلی — جو بہار کے نازوں کی تھی پلی
مجھے لگتی جس کی ادا بھلی — مجھے کنج میں تھی بلا رہی
یہاں گل شگفتہ تھے جا بجا — یہاں ننھا ڈیزی تھا ہنس رہا
یہاں مسکراتی تھی موتیا — یہاں چمپا ادا تھی دکھا رہی
نہ گلوں میں بوئے وفا رہی — نہ وہ دل فروز ادا رہی
نہ چمن رہا نہ فضا رہی — نہ وہ دن رہے نہ ہوا رہی
نہ روش ہے اب وہ سیر کی — نہ گلوں میں بو ہے وہ جہر کی

کہ ہوا ہے گلشن دہر کی
مجھے سبز باغ دکھا رہی

*****

سیماب اکبرآبادی

انقلاب

برہم نظامِ عالمیاں دیکھتا ہوں میں
یہ کیا تغیرات یہاں دیکھتا ہوں میں

برپا سمندروں میں ہیں طوفان آگ کے
موجِ ہوا کو شعلہ فشاں دیکھتا ہوں میں

اُس خاک پر جو حاملِ آبِ حیات تھی
انساں کا خونِ گرم رواں دیکھتا ہوں میں

بے رُت کے بادلوں کی طرح ہر طرف محیط
مظلومیت کے دل کا دھُواں دیکھتا ہوں میں

اب اُن مبصّروں کو جو یک سُو نگاہ تھے
اندیشہ مندِ سود و زیاں دیکھتا ہوں میں

جن رہبروں کے نقشِ قدم شمعِ راہ تھے
ان کو بہ کارِ راہزناں دیکھتا ہوں میں

ان خاکیوں کو جن پہ بساطِ زمیں ہے تنگ
دوشِ ہوا پہ رقص کناں دیکھتا ہوں میں

ان فانیوں میں جو نہیں مختارِ یک نفس
زعمِ حکومتِ دو جہاں دیکھتا ہوں میں

سوزِ دروں ہے ساز کے پردے میں نوحہ گر
رنگیں لبوں کو بجز فغاں دیکھتا ہوں میں

حسنِ فسردہ دل کی جبینِ صبیح پر
سردی کی چاندنی کا سماں دیکھتا ہوں میں

عشقِ ستم زدہ کے شبابِ ملیح پر
ٹھٹھرے ہوئے چمن کی خزاں دیکھتا ہوں میں

انساں شکارِ آب و ہوائے زمانہ ہے
نشتر بجائے ہر رگِ جاں دیکھتا ہوں میں

ہے خونِ لالہ زار سے بھیگی ہوئی بہار
بربادیوں کو مرثیہ خواں دیکھتا ہوں میں

ہے غارتِ چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ
شاخوں پر انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں

سیماب کون ہے مرے احساس میں شریک
کس کی نظر وہاں ہے جہاں دیکھتا ہوں میں

صدا بہ صحرا

کنارِ رودِ جمن سے تجھے پکار رہا ہوں　　نقوشِ رفتہ بہ نہ موج سے ابھار رہا ہوں
پھر آج دیدۂ پرنم میں ہے ترا رخِ رنگیں　　میں آج چاند کو گنگا میں پھر اتار رہا ہوں
اسی جہت سے کر اندازہ میری کاوشِ غم کا　　کہ نوکِ خار سے زلفِ چمن سنوار رہا ہوں
تجلیوں پہ تری دسترس جو تجھ کو نہیں ہے　　تو سنگ و خشت پہ گھبرا کے ہاتھ مار رہا ہوں
یہ آرزو ہے کہ پھر دعوتِ خرام تجھے دوں　　کنول کو آنسوؤں سے دھو کے نکھار رہا ہوں
فقیرِ خاک بسر ہوں مگر ہے اب بھی یہ جرأت　　ترے جمال پہ دونوں جہاں کو وار رہا ہوں
نوا کو اپنی لبِ آسودہ رہنے دے کچھ دن　　ابھی میں بگڑے ہوئے ساز کو سدھار رہا ہوں

محیط نور ہے سیماب میری فکرِ درخشاں
زلالِ زنگ کے انبار سے نکھار رہا ہوں

غزل

چمک جگنوں کی برقِ بے اماں معلوم ہوتی ہے
قفس میں رہ کے قدرِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

سحر تک سعیِ نالہ رائگاں معلوم ہوتی ہے
یہ دنیا تو بقدرِ یک فغاں معلوم ہوتی ہے

کسی کے دل میں گنجایش نہیں وہ بارِ ہستی ہوں
لحد کو بھی مری مٹی گراں معلوم ہوتی ہے

خزاں کے وقت بھی خاموش رہتی ہے فضا ساری
چمن کی پتی پتی رازداں معلوم ہوتی ہے

چمن کے سانحے کو مدتیں گزریں مگر اب بھی
چمکتی ہے جو بجلی آشیاں معلوم ہوتی ہے

ہوائے شوق کی قوت وہاں سے آئی ہے مجھ کو
جہاں منزل بھی گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

ترقی پر ہے روز افزوں خلش دردِ محبت کی
جہاں محسوس ہوتی ہے وہاں معلوم ہوتی ہے

قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے
کہ ہر بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

نہ کیوں سیماب مجھ کو قدر ہو ویرانیٔ دل کی
یہ بنیادِ نشاطِ دو جہاں معلوم ہوتی ہے

ضبط سے ناآشنا ہم، صبر سے بیگانہ ہم
انجمن میں ہیں شریکِ قسمتِ پروانہ ہم

خود ہی سازِ بے خودی کو چھیڑ دیتے ہیں کبھی
خود ہی سنتے ہیں حدیثِ ساغر و پیمانہ ہم

دفعتاً سازِ دو عالم بے صدا ہو جائے گا
کہتے کہتے رک گئے جس دن ترا افسانہ ہم

وحدت و کثرت میں ہیں دو جلوہ گاہیں دوست کی
اک تجلی خانہ دنیا، اک تجلی خانہ ہم

دل جلا پھر خود جلے پھر ساری دنیا جل اٹھی
سوز لائے تجھ سے بہ مقدار پرپروانہ ہم
جب ہمیں دیوانہ بننا ہے تو کیسی مصلحت
مصلحت کو بھی بنا لیں گے ترا دیوانہ ہم

قفس سے چھٹ کے بڑی دیر میں ٹھکانا نہ ملا
خیال سے بھی کہیں دور آشیانہ نہ ملا
تعینات کے پردوں میں چھپ کے بیٹھ گئے
حجاب کا یہ انھیں اور کچھ بہانہ نہ ملا
سنا ہے طور پہ تم بے حجاب آئے تھے
یہ رشک ہے کہ ہمیں کیوں وہ زمانہ نہ ملا

ساغر نظامی

ترانۂ وطن

اے وطن اے وطن اے وطن

جانِ من جانِ من جانِ من

ذرّے ذرّے میں محفل سجا دیں گے ہم   تیرے دیوار و در جگمگا دیں گے ہم

تجھ کو ہستی کا گلشن بنا دیں گے ہم   آسمانوں پہ تجھ کو بٹھا دیں گے ہم

بن کے دشمن ترا جو اُٹھے گا یہاں

اس کو تحت الثریٰ میں گرا دیں گے ہم

اور تحت الثریٰ کو فنا کے سمندر میں ارتھی بنا کر بہا دیں گے ہم

اے وطن اے وطن اے وطن

سُن لیں یہ اہلِ وجان و زمین و زمن

اے وطن اے وطن اے وطن

جانِ من جانِ من جانِ من

(۲)

سونے والوں کو اک دن جگا دیں گے ہم   آسمان و زمیں کو ہلا دیں گے ہم

بربریت کے ٹکڑے اڑا دیں گے ہم   رسم و راہِ غلامی مٹا دیں گے ہم

کون کہتا ہے کم زور و بزدل ہو تم

ہر طرف خون کے دریا بہا دیں گے ہم

جس طرف سے پکارے گا ہندوستان اس طرف ہی وفا کی صدا دیں گے ہم

ای وطن ای وطن ای وطن

سر سے باندھے ہوئے ہیں کفن ہی کفن

ای وطن ای وطن ای وطن

جانِ من جانِ من جانِ من

(۳)

تیری ہستی ہمالہ کی چوٹی بنی — ماہ و خورشید کی اس پہ بندی لگی

روشنی شرق سے غرب تک ہو گئی — سجدہ میں جھک گئی عظمتِ زندگی

عظمتِ زندگی کی قسم ہے ہمیں

تیری عزت پہ سر تک کٹا دیں گے ہم

وقت آنے دے ای جاں ترے نام پہ اپنی ہستی و مستی مٹا دیں گے ہم

ای وطن ای وطن ای وطن

خون سے اپنے بھر دیں گے گنگ و جمن

ای وطن ای وطن ای وطن

جانِ من جانِ من جانِ من

(۴)

مست و خوش بو ہواؤں سے تبتیل ہے تو — مادھری ہے منور ہے کومل ہے تو

پریم مدرا کی لبریز چھاگل ہے تو — سر پہ دنیا کے رحمت کا بادل ہے تو

آنکھ اٹھا کے جو دیکھا کسی نے تجھے

چھاؤنی اپنی لاشوں سے چھا دیں گے ہم

تیرے پاکیزہ پیکر کو روحوں کی باریک چادر کے نیچے چھپا دیں گے ہم

ای وطن ای وطن ای وطن
تجھ پہ قربان زر و مال و جان اور تن
ای وطن ای وطن ای وطن
جانِ من جانِ من جانِ من

(۵)

تیری ندیاں رسیلی مدھر نغمہ خواں تیرے پربت تیری عظمتوں کے نشاں
تیرے جنگل بھی ہنستے ہوئے گلستاں تیرے گلشن بھی رشکِ بہارِ جناں

زندہ باد ای غریبوں کے ہندوستاں
تیرا سکّہ دلوں پہ بٹھا دیں گے ہم
جو بھی پوچھے گا جنّت کا ہم سے پتا رادِ کشمیر اس کو بتا دیں گے ہم
ای وطن ای وطن ای وطن
تو چمن در چمن ہی عدن در عدن
ای وطن ای وطن ای وطن
جانِ من جانِ من جانِ من

(۶)

گلشنِ عیش و آرام و راحت ہی تو بےکسی میں کنارِ محبت ہی تو
بے کسوں اور غلاموں کی دولت ہی تو زندگی کے جہنّم میں جنّت ہی تو

سینچ کر خونِ دل سے تری کیاریاں
اور بھی تجھ کو جنّت بنا دیں گے ہم
بہ ہوء گلچیں کہ صیاد دونوں کے سر تیرے قدموں پہ اک دن جھکا دیں گے ہم
ای وطن ای وطن ای وطن

ہم ترے پھول ہیں تو ہمارا چمن
ای وطن ای وطن ای وطن
جانِ من جانِ من جانِ من

(۷)

جس کا پانی ہے امرت وہ مخزن ہے تو — جس کے دانے ہیں بجلی وہ خرمن ہے تو
جس کے کنکر ہیں ہیرے وہ معدن ہے تو — جس سے جنّت ہے دنیا وہ گلشن ہے تو
دیویوں دیوتاؤں کا مسکن ہے تو
تجھ کو سجدوں سے کعبہ بنا دیں گے ہم
تیری الفت نہیں سارے سنسار میں تیری عظمت کا ڈنکا بجا دیں گے ہم
ای وطن ای وطن ای وطن
یہ پھبن یہ وقار اور یہ بانکپن
ای وطن، ای وطن ای وطن
جانِ من جانِ من جانِ من

(۸)

یہ ستارے یہ نکھرا ہوا آسماں — آسماں سے ہمالہ کی سرگوشیاں
یہ تیری عظمتوں کا اٹل رازداں — مستقل، معتبر، محتشم رازداں
اس کی چوٹی سے خوں ریز دنیا کو پھر
ہم پیامِ حیات و فا دیں گے ہم
پھر محبت کا نغمہ سنا دیں گے ہم پھر زمانے کو جینا سکھا دیں گے ہم
ای وطن ای وطن ای وطن
زندگی پھر بھی لیگی بہاری شکن

اے وطن اے وطن اے وطن
جانِ من جانِ من جانِ من

سماج

کھل کھلاتے ہوئے چہروں پہ نہ جا جانِ بہار — اے مری جانِ بہار
خندہ جز شورشِ آغازِ بلا کچھ بھی نہیں
نغمہ جز ماتمِ تابوتِ صدا کچھ بھی نہیں
ہر روشِ صحنِ گلستاں کی مزار بُو ہے
گود میں موج تبسم کی فقط آنسو ہے
جگنوؤں کا یہ چراغاں ہے شراروں کا فریب
لالہ و گل کا تبسم ہے بہاروں کا فریب
کھل کھلاتے ہوئے چہروں پہ نہ جا جانِ بہار — اے مری جانِ بہار
چہچہاتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جا جانِ سخن — اے مری جانِ سخن
جھوٹ نے مستی گفتار میں بدلا ہے لباس
غیبت و کذب کی رنگین و تراشیدہ لباس
سحرِ تکذیب کے ٹھہرے ہوئے دھارے ہیں یہ ہونٹ
یا جہنم کے دریچوں کے کنارے ہیں یہ ہونٹ
جھوٹ سے فاش نہ ہونے کی قسم لیتے ہیں
سچ کو اک آن میں الہام بنا دیتے ہیں
چہچہاتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جا جانِ سخن — اے مری جانِ سخن

شہد آمیز نگاہوں پہ نہ جا کیفِ نظر — اے مرے کیفِ نظر
یوں تو شیریں ہیں مئے زیست کے جام
لیکن احساس میں یہ جام ہیں زہرآب تمام
تلخیاں جھانک رہی ہیں کوئی جیتا تو نہیں
بادۂ عیش جہاں میں کوئی پیتا تو نہیں
میٹھی میٹھی یہ نگاہیں یہ تبسم یہ سبا نہ
سب کے پردے میں ہے اک تلخ حقیقت کا راز
شہد آمیز نگاہوں پہ نہ جا کیفِ نظر — اے مرے کیفِ نظر
گنگناتی ہوئی باہوں پہ نہ جا سازِ خیال — اے مرے سازِ خیال
استعارہ ہیں یہ ہیروں سے لدی ٹہنی کا
اک ستون چاہیے اس بیل کو زر دوزی کا
حلقہ کرتی ہیں یہ زریں کمر و گردن کا
عکس پڑتا ہے بہاروں پہ ہی اس گلشن کا
فن ہو یا حسنِ جوانی ہو کہ پیغامبری
ہار پڑتا نہیں مفلس کے گلے میں یہ کبھی
گنگناتی ہوئی باہوں پہ نہ جا سازِ خیال — اے مرے سازِ خیال
عطر آلود نگاہوں پہ نہ جا روحِ گلاب — اے مری روحِ گلاب
اس طرف دیکھ کہ تو دیکھ کے رہ جائے گا دنگ
عہدِ تہذیب میں بھی آدمی ہے ننگ دھڑنگ
ہے یہی مرکزِ بو اور یہی مخزنِ رنگ
جسمِ عریاں پہ مگر جامۂ افلاس ہے تنگ

توشہ خانے سے غریبوں کے اڑے ہیں یہ لباس
خونِ مزدور کی خوشبو میں بسے ہیں یہ لباس
عطر آلود لباسوں پہ نہ جا روحِ گلاب — ای مری روحِ گلاب
ان خطرناک کھلونوں پہ نہ مٹ حُسنِ نظر — ای مرے حسنِ نظر

چلتے پھرتے جو نظر آتے ہیں تہذیب کے بُت
ترشے ترشائے ہوئے آذرِ تادیب کے بت
ان کے دل تنگ ہیں جاں سرد ہیں سینے تاریک
ان کے دریا ہیں سراب ان کے سفینے تاریک
کوئی در ان پہ سیہ کاریوں کا بند نہیں
جانِ ابلیس ہیں تہذیب کے فرزند نہیں
اِن خطرناک کھلونوں پہ نہ مٹ حسنِ نظر — ای مرے حسنِ نظر

ریگ زاروں کی گھٹاؤں پہ نہ جا کشتِ حیات — ای مری کشتِ حیات
کبھی مجبور پہ ہو بارشِ الطاف امیر
ایک ہو جائے کبھی قسمتِ صیاد و اسیر
زہر خود شہد بنے آب ہو خود موجۂ شیر
اپنی ہر کاٹ سے پیدا کرے امرت شمشیر
جذبۂ جبر کے ہونٹوں پہ تبسم ہو محال
ظلم کی روح کو احساسِ ترحم ہو محال
ریگ زاروں کی گھٹاؤں پہ نہ جا کشتِ حیات
مسکراتی ہوئی آنکھوں پہ نہ مٹ حُسنِ نظر — ای مرے حسنِ نظر

شاد عظیم آبادی

اگر مرتے ہوئے لب پر نہ تیرا نام آئے گا
تو میں مرنے سے درگزرا مرے کس کام آئے گا

شبِ ہجراں کی سختی ہو تو ہو لیکن یہ کیا کم ہے
کہ لب پر رات بھر رہ رہ کے تیرا نام آئے گا

عطا کی جب کہ خود پیرِ مغاں نے پی بھی لے زاہد
یہ کیا سوچتا ہے تجھ پہ کیوں الزام آئے گا

کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوب اے ساقی
خم آئے گا، صراحی آئے گی تب جام آئے گا

غضب نگاہ نے ساقی کی بندوبست کیا
شراب بعد کو دی پہلے سب کو مست کیا

مئے خودی نے کچھ ایسا دلوں کو مست کیا
کسی نے دھیان نہ پھر سوئے بود و ہست کیا

کوئی خفا ہو تو ہو امرِ حق مگر یوں ہے
بتوں کی چال نے سب کو خدا پرست کیا

بہت سے جام تھے پیرِ مغاں کے پیشِ نگاہ
کسی کو نیست کیا اور کسی کو ہست کیا

بلا سے صاف نہ دی یہ شرف نہیں کچھ کم
سیاہ کاروں کو ساقی نے مے پرست کیا

نہ سر میں سودا نہ دل میں آہیں نہ لب پہ ساقی فغاں رہے گی
یہی جو ساماں ہیں یہ نہ ہوں گے تو پھر محبت کہاں رہے گی

بنا چلا ڈھیر راکھ کا تو، بجھا چلا اپنے دل کی لیکن
بہت دنوں تک دبی دبائی یہ آگ اے کارواں رہے گی

بہت سے تنکے چنے تھے میں نے نہ مجھ سے صیاد تو خفا ہو
قفس میں گر مر بھی جاؤں گا میں نظر سوئے آشیاں رہے گی

ابھی سے ویرانہ پن عیاں ہے ابھی سے وحشت برس رہی ہے
ابھی تو سنتا ہوں کچھ دنوں تک بہار ای آشیاں رہے گی

ہزار نقشِ قدم مٹا کر زمانہ آنکھوں میں خاک ڈالے
جو تجھ سے چھوٹے ہیں ان کو تیری تلاش ای کارواں رہے گی

رہے ہر حال میں جو مطمئن جینا اسی کا ہے | پلائے جس کو خود پیرِ مغاں پینا اسی کا ہے
نگہ کی برچھیاں جو سہہ سکے سینہ اسی کا ہے | ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اسی کا ہے
یہ بزمِ مے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی | جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

دیکھا کیے وہ مست نگاہوں سے بار بار | جب تک شراب آئے کئی دور ہو گئے

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا | زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

لے کے خود پیرِ مغاں ہاتھ میں مینا آیا | وائے ای بادہ کشو پھر بھی نہ پینا آیا
آج تک دامنِ گل چاک ہے خیاطِ ازل | تجھ کو خلعت بھی حسینوں کا نہ سینا آیا

دل اپنی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم ای ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

مرغانِ ہوا نے پھولوں کو اک مژدہ دیکھلا بھیجا ہے
آنا ہے اگر تو آ جاؤ ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

شب کو مری چشم حسرت کا سب دردِ دل ان سے کہہ جانا
دانتوں میں دبا کر ہونٹ اپنا کچھ سوچ کے ان کا رہ جانا

ہم باغ میں ناحق آئے تھے بلبل کی حکایت سننے کو
منقار کو رکھ کر پھولوں پر کچھ اپنی زبان میں کہہ جانا

یہ رات بھیانک ہجر کی ہے کاٹیں گے بڑے آلام سے ہم
ملنے کی نہیں یہ کالی بلا سمجھے ہی ہوئے تھے شام سے ہم

تھا موت کا کھٹکا جان فرسا، صد شکر کہ نکلا وہ کانٹا
گر ہو نہ قیامت کا دھڑکا اب ہیں تو بڑے آرام سے ہم

اے ہم نفسو دم لینے دو وہ بھولے نغمے یاد آ لیں
آئے ہیں چمن میں اڑ کے ابھی چھوٹے ہیں اسی دم دام سے ہم

وہ سمجھے کہ میں نے مار لیا ہم سمجھے ملیں گے آخر وہ
ملتے ہی نگہ کے دونوں خوش آغاز سے وہ انجام سے ہم

دنیا میں تخلص کوئی نہ تھا کیا نیں کا ٹیکا شاد ہی تھا
تم وجہ نہ پوچھو کچھ اس کی چڑ جاتے ہیں کیوں اس نام سے ہم

احمد علی شوق

عالمِ خیال (دوسرا رخ)

عورت اپنے شوہر کے آنے کی امید میں ہے۔ شوہر کا خط عذر کے ساتھ پردیس سے آیا کہ وہ ابھی نہیں آسکتا۔ عورت بے چین ہو کر شوہر کو خط لکھ رہی ہے۔ اور اپنے خیالات ظاہر کرتی ہے۔

پاکے تمھارے خط کو آج دل کی تڑپ بڑھی کچھ اور
دل میں بھڑک کے غم کی آگ جسم پہ تپ چڑھی کچھ اور
در کی طرف تھی جو نگاہ یاس سے اب زمیں پہ ہے
ہاتھ کبھی جگر پہ ہے اور کبھی جبیں پہ ہے
ضعف سے جسم لٹ چلا روح بدن سے ہٹ چلی
چہرے کا رنگ کٹ چلا نبض کی چال گھٹ چلی
خط ہی تمھارے ہاتھ کا پڑھتی ہوں اس کو بار بار
کھولتی ہوں ہزار بار چومتی ہوں ہزار بار
سب کے جگر میں خون ہے میرے جگر میں درد ہے
سب کا شباب لال ہے، میرا شباب زرد ہے
دل میں چھپے ہو تم مگر چوس رہے ہو خون کو
سر میں خیال بن کے تم دیتے ہو شہ جنون کو
رکھتے نہیں یہ ہونٹ رنگ رکھتے نہیں یہ گال رنگ
تم نہیں تو نظر میں ہے خون کا رنگ، لال رنگ

خاک میں چوڑیاں ملیں، جی کو جلا رہی ہیں یہ
بھاڑ میں جائیں بجلیاں آگ لگا رہی ہیں یہ
تم میں وفا ہو یا نہ ہو یہ ہیں یہ کہوں کی ہے ضرور
ہاں یہ کہوں گی راہ کو روکے ہے کوئی شے ضرور
جذب میں کاش ہو یہ زور جو تمھیں لائے کھینچ کر
گھر مری پتلیوں کے ہیں ان میں بٹھائے کھینچ کر
کانپ کے دل میں لاؤ خوف اپنے خدا کا تم کبھی
اپنی وفا سے دو جواب میری وفا کا تم کبھی
آتی ہیں ہم نشیں مگر مجھ میں نہیں ہنسی مری
شرم سے کیا کہوں کہ "وہ" لے گئے دل لگی مری
پوچھتی ہیں تو کیا کہوں چھیڑتی ہیں تو کیا کہوں
سادھ کے چُپ لہو کے گھونٹ بیٹھی ہوئی پیا کروں
جھولنے کو جو وہ کہیں جاؤں میں اُٹھ کے جبر سے
گائیں تو گاؤں اُن کے ساتھ غم کو چھپا کے صبر سے
کی نہیں میں نے کچھ خطا، کی ہو تو بھول جاؤ تم
مجھ کو نہ دیکھنا مگر خیر سے گھر کو آؤ تم
آؤ جو تم تو رُخ پہ میں آنچل اُٹھا کے ڈال لوں
اس میں تو کچھ حرج نہیں، جھانک کے دیکھ بھال لوں
عورت اگر ہیں ہو پڑی اس میں مری خطا نہیں
یہ تو کہو کہ تم پہ کچھ میرا بھی حق ہے یا نہیں
پردہ میں رہ کے عورتیں مرتی ہیں گو قضا نہ ہو

شرم کا حق ادا کریں چاہ کا حق ادا نہ ہو
مجھ کو یقین ہے کہ تم آکے مجھے نہ پاؤ گے
آکے نہ پاؤ گے تو کیا، میری لحد پہ آؤ گے
فاتحہ بھی پڑھو گے تم ہاتھ اُٹھا کے یا نہیں
روح کو خوش کرو گے تم پھول چڑھا کے یا نہیں

ظفر علی خاں

خمستانِ ازل کا ساقی

پہنچتا ہے ہر اک مے کش کے آگے دورِ جام اس کا
کسی کو تشنہ لب رکھتا نہیں ہے لطفِ عام اس کا

گواہی دے رہی ہے اس کی یکتائی پہ ذات اس کی
دوئی کے نقش سب جھوٹے ہیں سچا ایک نام اس کا

ہر اک ذرہ فضا کا داستان اس کی سناتا ہے
ہر اک جھونکا ہوا کا آکے دیتا ہے پیام اس کا

میں اس کو کعبہ و بت خانے میں کیوں ڈھونڈنے نکلوں
مرے ٹوٹے ہوئے دل ہی کے اندر ہے قیام اس کا

مری افتادگی بھی میرے حق میں اس کی رحمت تھی
کہ گرتے گرتے بھی میں نے لیا دامن ہے تھام اس کا

وہ خود بھی بے نشاں ہے زخم بھی ہیں بے نشان اس کے
دیا ہے اس نے جو چرکا نہیں ہے التیام اس کا

نہ جا اس کے تحمل پر کہ ہے بے ڈھب گرفت اس کی
ڈر اس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

حکومت التجاؤں سے کبھی حاصل نہیں ہوتی — کوئی اللہ کا بندہ یہ کہہ دے مالوی جی سے

کبھی بھی سیدھی انگلی سے نہ نکلا ہے نہ نکلے گا
چپڑنا چاہتے ہیں اپنے پھلکے آپ جس گھی سے

ریزولیوشن کہاں تک پاس کرتے ہم چلے جائیں
یہ چکی کانگریس بیٹھی ہوئی کس وقت تک پیسے

نہیں ملتی ہے جلسوں اور تقریروں سے آزادی
جو ملتی ہے تو ملتی ہے پھبتی اور لٹھیتی سے

وہ گوکل کا گوالا جو ہے میٹھی بانسری والا
یہ کہتا ہے کہ بھینس اس کی جو ہانکے اس کو لاٹھی سے

سخنورانِ عہد سے خطاب

اے نکتہ ورانِ سخن آرا و سخن سنج
اے نغمہ گرانِ چمنستانِ معانی

مانا کہ دل افروز ہے افسانۂ عذرا
مانا کہ دل آویز ہے سلمیٰ کی کہانی

مانا کہ اگر چھیڑ حسینوں سے چلی جائے
کٹ جائے گا اس مشغلے میں عہدِ جوانی

گرمائے گا یہ ہمہمہ افسردہ دلوں کو
بڑھ جائے گی دریائے طبیعت کی روانی

مانا کہ ہیں آپ اپنے زمانے کے نظیری
مانا کہ ہر اک آپ میں ہے عرفیِ ثانی

مانا کہ حدیث خط و رخسار کے آگے
بیکار ہے مشائیوں کی فلسفہ دانی

مانا کہ یہی زلف و خط و خال کی روداد
ہے مایۂ گلکاریِ ایوانِ معانی

لیکن کبھی اس بات کو بھی آپ نے سوچا
یہ آپ کی تقویم ہے صدیوں کی پرانی

معشوق نئے بزم نئی رنگ نیا ہے
پیدا نئے خاکے ہوئے ہیں اور نئے مانی

مژگاں کی سناں کے عوض اب سنتی ہے محفل
کانٹوں کی کتھا برہنہ پائی کی زبانی

لذت وہ کہاں لعلِ لبِ یار میں ہے آج
جو دیتی ہے پیٹ کے بھوکوں کو کہانی

بدلا ہے زمانہ تو بدلیے روش اپنی
جو قوم ہے بیدار یہ ہے اس کی نشانی

اے ہم نفسو یاد رہے خوب یہ تم کو
بستی نئی مشرق میں ہمیں کو ہے بسانی

"چُو" کی لفظی تحقیق

اشنان کرنے گھر سے چلے لالہ لال چند
اور آگے آگے لالہ کے اُن کی بہو گئی

پوچھا جو مَیں نے لالہ للائن کہاں گئیں
نیچی نظر سے کہنے لگے وہ بھی چُو گئی

مَیں نے دیا جواب انہیں ازرہِ مذاق
کیا وہ بھی کوئی چھت تھی کہ بارش سے چُو گئی

کہنے لگے کہ آپ بھی ہیں مسخرے عجب
اب تک بھی آپ سے نہ تمسخر کی خُو گئی

"چُو" ہوشیار پور میں ندی سے ہے مراد
بی بی تمیز بھی وہیں کرنے وضو گئی

مَیں نے کہا کہ "چو" سے اگر ہے مراد "جُو"
پھر یوں کہو کہ تا بہ لبِ آبِ جُو گئی

کیوں اینٹھتے ہیں ماش کے آٹے کی طرح آپ
دھوتی سے آپ کی نہیں ہلدی کی بُو گئی

لطفِ زباں سے کیا ہو سروکار آپ کو
دامن کو آپ کے نہیں تہذیب چھُو گئی

ہندی نے آکے جیم کو چے سے بدل دیا
چو آئی کوہسار میں گلشن سے جُو گئی

لہجہ ہوا درست زباں ہوگئی کرخت

لطفِ کلام و شستگیٔ گفتگو گئی

معنی کو ہے گلہ کہ ہوا بے حجاب میں
شکوہ ہے لفظ کو کہ مری آبرو گئی

افسوس ملک میں نہ رہی فارسی کی قدر
مستی اُڑی شراب سے پھولوں سے بو گئی

ظریف لکھنوی

افیونیوں کا رجز (۱۹۱۴-۱۹۱۸)

ہم لوگ ہیں افیونی جب رنگ جما دیں گے
جرمن ترے نقشے کو مٹی میں ملا دیں گے

تو ہم سے بہادر یا ہم تجھ سے بہادر ہیں
پینک سے ذرا چونکیں پھر تجھ کو بتا دیں گے

سرکار کے دشمن کو ہم کوس کے کھالیں گے
اور اپنے تصور سے نام اس کا مٹا دیں گے

رستم سے سوا طاقت ہو جائے گی ہم سب میں
جب چائے میں بالائی تھوڑی سی ملا دیں گے

لٹھ لے کے جہاں پہنچے سر توڑ دیا فوراً
جرمن تری توپوں میں ہم بالش چلا دیں گے

زیپلین جو اڑاتا ہے جرمن ہمیں کیا پروا
کنکوے میں چمٹا کر میدان میں گرا دیں گے

اتنے تجھے ہم ڈھیلے ماریں گے ابے جرمن
خاکی تری وردی کو مٹی میں ملا دیں گے

تو مار بھی ڈالے گا تو یادرکھ اے جرمن
بھتنا تجھے بن بن کے راتوں کو ڈرا دیں گے

ہم رُوس سے ناخوش تھے اب اس سے بہت خوش ہیں
ٹھیکے پہ جو آئے گا افیون پلا دیں گے
ترکوں سے کوئی کہہ دے کیوں لڑتے ہو اے آقا
تم جان اگر دوگے جرمن تمھیں کیا دیں گے
واللہ ظریفیت ایسا لکھا یہ رجز تم نے
ہم سب کا ارادہ ہے چندے سے جلا دیں گے

نئی تہذیب تجھ میں ہے نرالا جذبِ پنہانی
دھرم ہندو کا غائب اور مسلماں کی مسلمانی
نظر باز، جوانی ہوگی اس کی دید کے قابل
ابھی تو گھٹنیوں چلنے لگا ہے ذوقِ عریانی

ستم ایجاد کہتے ہیں یہ کیوں معشوق کو شاعر
ستم بھی کیا کوئی کل ہے جسے ایجاد کرتے ہیں
بگولا ہیں کوئی معشوق، آندھی ہیں کہ جھکڑ ہیں
کہ چل کر عاشقوں کی خاک کو برباد کرتے ہیں

صفت تو دیکھیے ہر چند ہمت خود مونث ہے
زنانہ یہ پہن کر جامۂ مردانہ آتا ہے
رقیب آئے تو اس سے چھوٹ لڑنے کا ارادہ ہے
پٹا آتا ہے، بانک آتی ہے، مجھ کو بانہ آتا ہے

گہ رُخ پہ نقاب اس کے ہی گہ ہاتھ میں تلوار
معشوق وہ معشوق جو سادہ بھی ہو پرزہ بھی
یہ حسن نرالا ہی کہ دو عضو ندارد
معشوق وہ ہی جس کے دہن بھی ہو کمر بھی

دو تک آہ رقیبوں کو بھگا آتی ہی ۔ بکھر اُڑ جاتے ہیں جب وقت ہوا آتی ہی
دو ہی کام آتے ہیں معشوق کو دُنیا میں فقط ۔ یا جفا آتی ہی یا اُن کو دغا آتی ہی

اُلفت میں ہر اک نقشہ اُلٹا نظر آتا ہی ۔ مجنوں نظر آتی ہی لیلیٰ نظر آتا ہی

یار کی محفل میں جو سامان تماشا ہا نہ تھا
شمع گھنٹہ گھر تھی ہاتھی سے بڑا پروانہ تھا

عظمت اللہ خاں

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا — مرے جی کو یہ آگ لگا سی گئی
مجھے میٹھ یہاں کوئی پل نہ ملا — مرے جی کو یہ آگ جلا سی گئی

مرے نانیہ کے پوت تھے تم، سبھی ہم — رہے ایک جگہ پلے ایک ہی ساتھ
مرے باپ نے عمر جو پائی تھی کم — انھیں چھین کے لے گیا موت کا ہاتھ

بس تھی ننھی سی جان غریب بڑی — کبھی بھول کے دکھ نہ کسی کو دیا
نہ تو روٹھی کبھی نہ کسی سے لڑی — مری باتوں نے گھر ہی کو موہ لیا

تھے تو بالے ہی تم پہ تھا تم کو بڑا — مرا دھیان کسی کی مجال نہ تھی
مجھے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھے ذرا — مجھے کھیل میں بھی تو کبھی نہ دکھی

مرے سر میں تمھارا ہی دھیان بسا — مری چاہ کے راج دلارے بنے
تمھیں دیوتا مان کے من میں رکھا — مری بھول سی آنکھوں کے تارے بنے

مرا جیو ابھی سے ہی اس پہ فدا — یہ کھولی ہی موہنی میری بہو
یہ جی کا کہا مرے دل نے لکھا — وہیں دوڑ گیا مرے منہ پہ لہو

اسی بات کے گھر میں جو چرچے ہوئے — سبھی کہتے تھے مجھ کو تمہاری دُلھن
مجھے تم نے بھی اپنے لگا کے گلے — کئی بار کہا مری پیاری دُلہن

اسی طرح گزر گئے چند برس — بڑھی عمر ہماری حیا بھی بڑھی
تمھیں پڑھنے کی دھن لگی ایسی کہ بس — بڑے شوق سے ساری پڑھائی پڑھی

مجھے تم نے پڑھایا بھی پہلے پہل — مجھے پڑھنے کا خوب ہی شوق ہوا
لگی چلنے ترت، ترے اپنے ہی بل — یونہیں آپ ہی علم کا ذوق ہوا

تمھیں پڑھنے کو دُور جو بھیجا گیا — بڑے شوق سے خوب ہی کام کیا
کوئی تم نے دقیقہ اُٹھا نہ رکھا — بڑی محنتیں کیں بڑا نام کیا

ہوئے پڑھ کے نچنت تو عہدہ ملا — ہوا گیان کا گن کا جو شہر میں نام
یہ مزے کا نیا ہی شگوفہ کھلا — لگے مینہ کی طرح سے برسنے پیام

مرے تایا بڑے تھے زمانہ شناس — بڑے اونچے گھرانے میں ٹھیرا پیام
گیا ٹوٹ سا جی گئی ٹوٹ سی آس — مری چاہ کا ہو گیا کام تمام

بڑی دھوم سے آئی تمہاری دُلھن — میں بھی کام میں بیاہ کے ایسی جُتی
کوئی اور تھی گو مری پیاری دُلھن — کہا سب نے بڑی ہے بہن کو خوشی

مرے دل کی کسی کو بھی تھی نہ خبر　　مری چاہ کسی پہ نہ فاش ہوئی
بنی جان پہ اتنی کی آفت نہ مگر　　مرے واسطے بر کی تلاش ہوئی

مرا ایک جگہ جو بیاہ ہوم لگا　　مرے دل سے تڑپ کے یہ نکلی دعا
نہیں چاہ ہی دل میں تو بیاہ ہے کیا　　تو خدایا یونہیں مجھے جگ سے اٹھا

مجھے چاہ نے کھا لیا گھن کی طرح　　مری جان کی کل سی بگڑ ہی گئی
مرا جسم بھی بھن گیا بن کی طرح　　یونہیں بستر مرگ پہ پڑ ہی گئی

مرا آخری وقت ہی آن لگا　　کوئی اور تمھاری ہے "پیاری دلھن"
مجھے اب بھی تمھارا ہی دھیان بسا　　نہ بنی پہ رہی ہوں تمھاری "دلھن"

مرے جیتے جی پیت کا پھل یہ ملا　　مرے تن کو یہ آگ لگا ہی گئی
مجھے پیار کی ریت کا پھل یہ ملا　　مرے تن کو یہ آگ جلا ہی گئی

پیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

(۱)

کامنی کویل تھی تو
حسن رسیلا ترا
کوکتی کویل تھی تو
مشتبہ سر بلا ترا
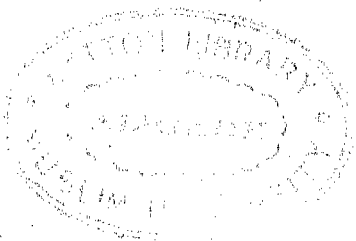
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

(۲)

عشق کی دیوی تھی تو
شعر میں یکتا تھی تو
حسن کی پتلی تھی تو
ایک کویتا تھی تو

پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

(۳)

باز بہادر ترا
حسن کا شیدا رہا
تو نے اسے دل دیا
ایک سراپا وفا

پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

(۴)

خوب تھی قسمت تری
سات برس عیش تھے
شعر و سخن موسیقی
حسن حکومت مزے

پیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

(۵)

دکھ کی جو آئی گھڑی
اور چھڑی راگنی

دن تھا نہ وہ رات تھی
عیش کی محفل اُٹھی

پیت کی ماری ستی مشاعرہ رو پا متی

(۶)

اکبر کی لشکر کی موج
ایسی اُمڈ آئی تھی
باز بہادر کی فوج
بکھری پھٹی کائی سی

پیت کی ماری ستی مشاعرہ رو پا متی

(۷)

باز بہادر ترا
جان چھپا اُڑ گیا
آنچ میں ڈالا گیا
تیرا دل بے وفا

پیت کی ماری ستی مشاعرہ رو پا متی

(۸)

باز بہادر کا تھا
تیرا جو دل ہو چکا
اور کسی کا بھلا
ہو سکے ممکن نہ تھا

پیت کی ماری ستی مشاعرہ رو پا متی

(۹)

ایک طرف تھی وفا
ایک طرف جان تھی
سچ کا تقاضا یہ تھا
جان ہی قربان تھی

پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

(۱۰)

موت تری موت تھی
عشق کی دیوی تری
موت وہ تھی جان بھی
جس پہ ہو قربان کی

پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

(۱۱)

کوئی زبردست ہاتھ
تیری گھڑی جھیلتا
دل کوئی مردانہ ساتھ
جان پہ یوں کھیلتا

پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

۱۲

چاہ کا اپنی دیا
ایسا دیا ہی جلا

اور بھی دیے کا جلا
سانس اُسے وقت کا

پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

"سندر صورت سندر ہی ہر رنگت گوری یا کالی"

اندھرا دیس کی سندر رتنری کالی کویل سی کالی
بال بھی کالے گھنگھور گھٹا
ہونٹ وہ گدرے جامن کے سے اور دھیٹیں لالی
دانت وہ اُجلے موتی کی جلا

بڑی بڑی سی آنکھ غلافی پُتلی بھونرا سی کالی
خمار اک مستانہ چھایا
وہ من موہنی متھنا جیسی ان میں چمک ناگن والی
آنکھ لڑی اور دل کو لبھایا

اور سراپا گدرا گدرا سانچے میں ڈھلا لچکیلا
جوش جوانی پھٹتا جوبن
بھرا بھرا سا ڈھلا ڈھلایا وہ اک اک عضو سجیلا
وہ ہر چیز کا بے ساختہ پن

اک موج چھلکتی مچلاتی چڑھتی اُترتی لہراتی

وہ گردن کا نفیس طرح ہلاؤ
سینہ مستی کا جوالا مکھ کمر لچکتی بل کھاتی
وہ ہوش ربا اُتار چڑھاؤ

سندر صورت سندر ہی ہے گوری یا کالی
فطرت نے ہے جس رنگ میں ڈھالی
فطرت کے لیے حسن یہی ہے سچ دیکھ گر ماننے والے
جان کی کھیتی جوتنے والی

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے
کوئی شے بھلی بری نہیں ہے کوئی بات یاں اٹل نہیں ہے
ہے یہ زندگی عجب پہیلی کوئی اس کا یاں تو حل نہیں ہے
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
کسی گود ممتا بھری کی میں بھی نازوں میں کبھی پلی تھی
کسی آنکھ کی تتی میں بھی پتلی میں بھی نازوں میں کبھی پلی تھی
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
ابھی کچھ ہوئی نہ تھی سیانی کہ اٹھا بڑوں کا سر سے سایہ
تو زمانے نے یہ پلٹا کھایا کہ کسی کو پھر نہ اپنا پایا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے
یہ کٹر دلوں کی تو نا ہتی میرے من میں بیری ہی بیٹھی
گئی من کے پھول کی تراوٹ اڑی اوس کی طرح سے ہنسی

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

نہ رہا کسی پہ کچھ بھروسا نہ رہا کوئی مرا سہارا

نہ رہی کسی کی بیٹی پیاری نہ رہا کوئی مرا بھی پیارا

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

تھیں وہیں پڑوس میں طوائف تھا بڑا ہی نامی اُن کا ڈیرا

مرے سر پہ ہاتھ انھوں نے رکھا مجھے پیار سے سبھوں نے گھیرا

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

مجھے چاؤ چونچلوں سے پالا مری تربیت کا ڈول ڈالا

مجھے گانا ناچنا سکھایا مرے من کو تن بدن میں ڈھالا

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

غرض اس طرح کی پا کے سکھشا نظر آئی زیست ایک میلا

ہیں جہاں جوئے کی سب دکانیں وہیں ہار جیت کا جھمیلا

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

تھی حسینوں میں مری نہ گنتی نہ تو مورتی نہ میں پری تھی

مرا رنگ سانولا سلونا مری نین بجلیاں بھری تھی

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

مرے بال کالے لانبے لانبے کہ اٹھا ہو ابر جیسے کالا

مرا سینہ بھی ابھر آیا دل بھری بجلیوں سے تھرتھرایا

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

مرے عاشقوں کی تھی نہ گنتی مرا فن میں تھا بلند پایا

مرے گرد دھن برس رہا تھا میں دھنی ہوئی وہ دھن کمایا

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

جو ہیں نیک آپ کو سمجھتے مجھے بیسوا پکارتے ہیں

وہ مگر ہیں اصلیت سے کورے بڑی باتیں ہی بگھارتے ہیں

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

ہو نکاح یا کہ آشنائی کسی رنگ سے ہے پیٹ بھرنا

کہیں عیش اور عشق بازی کہیں رنگ سے ہی پیٹ بھرنا

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

مجھے ایک تیتری سمجھیے مرا کام پھول پھول اڑنا

کبھی اس کے واسطے ٹھٹکنا کبھی پنکھڑی پہ جھول اڑنا

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

مری زندگی سبق ہے کہ یہاں کی خوب سیر کی ہے

ہو مزے کی چیز یہ دنیا تو شر کی ہے نہ خیر کی ہے

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

برکھا رت کا پہلا مینہ

آئے بادل کالے کالے جھومتے ہاتھی متوالے — الہڑ پیچھے تلے جھکتے

ایک اندھیری دے کر چھا گئے ڈیرے چار طرف ڈالے — پون کے گھوڑوں سے بھی تیکھے

بجلی چمکی انگارا سی آگ کی ناگن لہرائی — لہریا کاڑھا بیل بنائی

چھاپ کے دریا میں قدرت نے نور کی مچھلی تیرائی — ادھر ادھر تڑپی گھبرائی

بادل گرجے وہ گڑگڑاہٹ آئی لڑھکتی لڑھکاتی   کروڑ گھوڑے دوڑاتی
باڑھوں پہ باڑھیں داغتی آتی اور کڑکتی کڑکاتی   پہاڑ لڑھکاتی ٹکراتی

بجلی چمکی بادل گرجے مینھ اور پون دھنواں دھار   ندی کا پانی وہ دھائیں دھائیں
بجلی ناچے تھاپ گرج کی مینھ نے چھیڑ دیا ستار   پون کا گانا وہ سائیں سائیں

بادل بکھرے نیلا امبر ڈوبتے سورج نے جھانکا   کرنیں سنہری ترچھی ترچھی
بکھریں ہوا میں کھیلتی کھیلتی میگھ کو سارا رنگ دیا   آکاش پہ اک آگ لگائی

عزیز لکھنوی

جلوہ دکھلائے جو وہ اپنی خود آرائی کا
نور جل جائے ابھی چشم تماشائی کا

رنگ ہر پھول میں ہے حسنِ خود آرائی کا
چمن دہر ہے محضر تری یکتائی کا

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

اُف ترے حسنِ جہاں سوز کی پُرزور کشش
نور سب کھینچ لیا چشم تماشائی کا

دیکھ کر نظمِ دو عالم ہمیں کہنا ہی پڑا
سلسلہ ہے یہ کسی انجمن آرائی کا

گل جو گلزار میں ہیں گوش بر آواز عزیز
مجھ سے بلبل نے لیا طرز یہ شیوائی کا

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

واہمہ مجھ کو دکھاتا ہے جنوں کے ساماں
نظر آتا ہے مجھے گھر کا بیاباں ہونا

حادثے دونوں یہ عالم میں اہم گزرے ہیں
میرا مرنا تری زلفوں کا پریشاں ہونا

جوش میں لے کے اک انگڑائی کسی کا کہنا
تم کو آتا ہی نہیں چاک گریباں ہونا

سُرخ ڈورے تری آنکھوں کے الٰہی توبہ
چاہیے تھا انھیں پیوستِ رگِ جاں ہونا

ہو چلیں آپ کے بیمار کی آنکھیں بے نور
قہر تھا صبح کے تارے کا نمایاں ہونا

ان سے کرتا ہے دمِ نزع وصیت یہ عزیز
خلق رو دے گی مگر تم نہ پریشاں ہونا

وہ نگاہیں کیا کہوں کیوں کر رگِ جاں ہو گئیں
دل میں نشتر بن کے ڈوبیں اور پنہاں ہو گئیں

تھیں جو کل تک جلوہ افروزی سے شمعِ انجمن
آج وہ شکلیں چراغِ زیرِ داماں ہو گئیں

اک نظر گھبرا کے کی اپنی طرف اس شوخ نے
ہستیاں جب مٹ کے اجزائے پریشاں ہو گئیں

اڑ کے دل کی خاک کے ذرے گئے جب جب طرف
رفتہ رفتہ وہ زمینیں سب بیاباں ہو گئیں

اس کی شامِ غم پہ صدقے ہو مری صبحِ حیات
جس کے ماتم میں تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

یہ مشورے ہم اٹھے ہیں چارہ جو کرتے
کہ اب مریض کو اچھا تھا قبلہ رو کرتے

زبان رک گئی آخر سحر کے ہوتے ہی
تمام رات کٹی دل سے گفتگو کرتے

سوادِ شہرِ خموشاں کا دیکھئے منظر
سنا نہ ہو جو خموشی کو گفتگو کرتے

یقین تھا کہ ملتا ہمیں زمیں کی تہ جا کر
بجد سعی اگر اس کی جستجو کرتے

تمام ہونے کی لذت اسی پہ تھی موقوف
کہ زندگی میں کبھی تم سے گفتگو کرتے

جواب حضرتِ ناصح کو ہم بھی کچھ دیتے
جو گفتگو کے طریقے سے گفتگو کرتے

پہنچ کے حشر کے میدان میں بھول کیوں ہو عزیز
ابھی تو پہلی ہی منزل ہے جستجو کرتے

متفرق اشعار

شمع بجھ کر رہ گئی پروانہ جل کر رہ گیا
یادگارِ حسن و عشق اک داغ دل پر رہ گیا

آگ تو دل کی بجھا لینے دو پھر کچھ پوچھنا
ہوش کس کو جو بتائے کیا رہا کیا جل گیا

ہے اُن کی بزم میں ہر شخص اپنے عالم میں
کسی کا راز کسی پر عیاں نہیں ہوتا

تا چند ضبطِ آہ کہ گھٹنے لگا ہے جی
یا آج آسمان نہیں یا ہمیں نہیں

ہمہ مطرب میں کبھی سوز نہ ہو ساز نہ ہو
پردۂ ساز میں گر آپ کی آواز نہ ہو
آج صیاد نے فرمانِ رہائی تو دیا
مگر اُن کو کہ جنھیں طاقتِ پرواز نہ ہو

چند گھنٹوں کے تڑپنے کا سماں دیکھا ہے
مرنے والوں کو ابھی تم نے کہاں دیکھا ہے

اک تغیر حسن کی فطرت میں برپا ہو گیا
جب مرے شکوے انھیں کچھ کچھ مزا دینے لگے

سب اکیلے اس جہاں سے ہم گئے — لے کے اپنے ساتھ اک عالم گئے

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی — اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی
ہجر کی رات کاٹنے والے — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

دل تابع کشش تھا کشش تابع جمال — ہاں ہاں محبت آپ سے کی اور ضرور کی

دنیا کہاں رہے گی بتا اے نگاہِ مست — ایسے ہی چند دور جو ساغر کے ہو گئے

تھی صبح اور تارے کچھ جھلملا رہے تھے — بیمارِ شامِ فرقت دنیا سے جا رہے تھے

عبدالرحمن بجنوری

معلّم الملکوت

تھا عدم میں نقشِ ہستی جب کہ بے نام و نمود
قدرتِ خالق نے پائی تھی نہ خلقت میں نمود

سب سے پہلے لفظِ کُن بن کر قضا ظاہر ہوا
حلقۂ پرکاری کو جس کے وقت رہ پیدا ہوا

وسعتِ عالم نے پائی وسعتِ بحرِ اثیر
قدرت اور طاقت نفس سمجھا جس کی موجوں میں اسیر

کشمکش نے دونوں کی آمادہ اک طوفاں کیا
الفت اور نفرت نے برپا سخت اک ہیجان کیا

ارتعاشِ عشق نے پیدا کیا وہ سوزِ دل
ہو گیا جس کے اثر سے آبِ دریا مشتعل

سینۂ دریا سے باہر نکلا اک روشن سحاب
درفشاں خو گرفتہ گرمئ صد آفتاب

قرنہا تک جب یہ آتش خانہ یوں جلتا رہا
جوں سمندر اس کے انگاروں میں پیدا ہوا

میں سراپا شعلہ تھا اور وہ سراپا نور تھا
میں گیا اور وہ گیا لیکن نہ اس سے دور تھا

حسن جب اظہار جو جلوہ کناں کوئی نہ تھا
بہر روئے یار اس دم میں ہی تو آئینہ تھا

سب سے پہلے معرفت سے میں نے ہی جانا اُسے
سب سے پہلے میں نے عالم ہی میں پہچانا اُسے

عمرہا یوں شعلہ افشاں رہ کے بیزارِ عظیم
بجھ گئی بس ماندہ باقی رہ گئی خاکِ لئیم

ہائے قسمت تھا نہیں اُف یہ ہی خاکِ رقیب
کاش اسی دم مجھ کو ہوتا علم ای میرے نصیب

عرش کا پایہ پکڑ کر روتا کہتا ای خدا
خالقِ کون و مکاں! فریاد ہے عالم پناہ

کر نہ پیدا اس کو روئے ارض پر یہ بنیاد
ڈالے گا عصیاں سے اپنے کُل خدائی میں فساد

تھا یونہیں امرِ قضا ہونا جو تھا وہ ہی ہوا
امرِ حق صادر ہوا فرمانِ حق پورا ہوا

کل فرشتوں نے گِلِ مردود کی تخمیر کی
اور آب و گِل سے اس کی صورت اک تعمیر کی

قلبِ ماہیت سے عاری کالبد عریاں سفید
بے پر و شہپال، چشم و سر سیہ دنداں سفید

وارثِ تختِ خلافت رونقِ باغِ جناں
ہے یہ آدم سب کریں سجدہ اسے خورد و کلاں

حکمِ باری پر ملائک نے اسے سجدہ کیا
سب بہ سجدہ ہو گئے اک میں ہی باقی رہ گیا

اس کو سجدہ کرنے میں کیا کچھ تجھے انکار ہے
"ہاں مجھے انکار ہے انکار ہے بس عار ہے"

"عار ہے" کہتا ہے کیا ڈر تجھ پہ ہے قہرِ خدا
عار ہے تجھ کو ملائک نے جب سجدہ کیا

ان کی حالت اور تھی اور میری حالت اور ہے
رسمِ طاعت اور ہے رسمِ محبت اور ہے

حکمِ ربی ہے کہ میں سجدہ کروں لیکن نہیں
غیر کو سجدہ کروں مجھ سے تو یہ ممکن نہیں

نٹ راجا

لغزش میں نشے کے بتِ طنازِ شرابی
سیماب شمائل
گرداب حمائل
تصویر بنی میں ہمہ رقصاں تنِ شوخی

یک دست میں گردش بھی رواں شیشۂ عرفاں
زہرابِ نوشیں
پرکالۂ نوریں
یک دست میں انوار فشاں شعلۂ یزداں

دارائے جہاں بت شکن مادہ باطل
منصورِ حقیقی
مغلوبِ مجازی
دنیائے دنی طفلک افتادہ غافل

ہیں انگلیاں بے تاب کہ جنبش میں خدائی
سرشوخئ مدہوش
موسیقئ خاموش
اعجاز ہے ہر ضربۂ انگشت الٰہی

آغوش میں فوّارۂ یخ بستہ کی بر تاب
تحریک خموشاں
خاموشی جنباں
کب قید ہو تصویر میں سیار رقصاں شبِ بے تاب

عزیز احمد عزیز

سلوریتا

(سان ریمو۔ اطالوی ریویرا۔ گرمیوں کے موسم میں سرِشام سمندر کے کنارے)

سلوریتا نے کہا "سچ کہنا
اور کس کس سے یہی تم نے کہا"
رک گیا میں تو کہا "پھر خاموش؟
ایک دو جام میں اتنے مدہوش"
ان کی آنکھوں کو جو دیکھا تو شرارت کی جھلک
اور ہونٹوں پہ وہی برقِ تبسم کی چمک
جسم میں تازگی و عطر و نفاست کی مہک
ہاتھ کو چوم کے میں نے یہ کہا
"ہے یہ الزام ذرا بے جا سا
مجھ گلفام کو کیوں کرتی ہیں ناحق بدنام
ہیں خطاکار تو ہیں آپ کی آنکھوں کے جام
آپ کے حسن سے سرشار ہوں میں
کیجیے انصاف خطاوار ہوں میں؟"
سلوریتا نے کہا "سچ کہنا
اور کس کس سے یہی تم نے کہا؟"

ایسے جملوں کی تو شاید تمھیں عادت سی ہو
ہاں تمھیں ہر کس و ناکس سے محبت سی ہو
ہے یہی مردوں کی عادت جو یہی
کاش اک تھوڑی سی جدّت ہوتی"
پھیلتی جاتی تھی تاریکیٔ شام
دستِ نازک کو لیا میں نے تھام
مڑ کے دیکھا تو کوئی اور نہ تھا
اس کے رخساروں کو جھک کر چوما
پھر کہا "مجھ کو ترے حسنِ فروزاں کی قسم
تیری آنکھوں کی ترے کاکلِ پیچاں کی قسم
اس خموشی میں سمندر کے ترنم کی قسم
تیرے ہونٹوں پہ ملامت کے تبسم کی قسم....."
میں ابھی اور بھی قسمیں کھاتا
اس تبسم نے مگر روک لیا
سلو رینا نے کہا "سچ کہنا
اور کس کس سے یہی تم نے کہا"
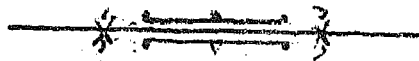
خلیفہ عبدالحکیم

دل یہ کبھی تو کعبہ ہے اور کبھی سومنات ہے

اشک بہا کے کیوں کہوں جو ہے سو بے ثبات ہے
ذوقِ تغیرات میں
تازگیٔ حیات میں

جامۂ زندگی کا رنگ تازہ بہ تازہ نو بہ نو
حسنِ رخِ حیات ہے
عظمتِ کائنات ہے

نقطۂ تیز سیر سے بن گئے دائرے یہاں
لاکھ طرح ہوئی بیاں
اصل میں ایک بات ہے

ہوگئیں کیا نظر فروز کثرتِ غم کی ظلمتیں
اتنی ہے تابشِ نجوم
جتنی اندھیری رات ہے

شغل مرا صنم گری اور کبھی حرم گری
دل یہ کبھی تو کعبہ ہے
اور کبھی سومنات ہے

فنِ لطیف

پیغام برِ عشق کبھی شعر کبھی چنگ
اور حسن کا حامل ہے کبھی رنگ کبھی سنگ
دنیائے لطافت میں ہے بیکار رہم آہنگ
اظہارِ حقیقت پہ ہے لفظوں کی قبا تنگ

فطرت نے تھا ادراک سے جو راز چھپایا
وہ تو نے بتایا

تجھ سے ہے لبِ دردنہاں پر ہے تبسم
آسودہ کنارے کی طرح شورشِ تلاطم
ہنگامۂ ہستی کو بناتا ہے ترنم
کثرت کی کشاکش خم وحدت میں ہوئی گم

جس ذات کی خلوت میں زماں ہے نہ مکاں ہے
وہ تجھ پہ عیاں ہے

ہے ساز میں اعراض کے یہ ذات کی آواز
یا نفیٔ حقیقت میں ہے اثبات کی آواز
ہے فطرت ساکت کی مناجات کی آواز
جو بات ہے بے صوت ہے اس بات کی آواز

یہ دل کی شریعت ہے یہ دل کی ہے طریقت
افشائے حقیقت

ہر راگ ہے آئینۂ زیر و بم ہستی

آئینے میں لیکن نہ بلندی ہے نہ پستی
بے ہوشی میں بھی محرمِ اسرار ہے مستی
روحوں کو غذا دیتی ہے یہ مادّہ پرستی

جو ذوقِ کشاکش ہے ہر اک ذرے میں بے تاب
ہے تجھ میں سکوں یاب

تیرے حرمِ ناز میں ہے پردہ رُخِ بود
جو دہر میں مفقود ہے وہ تجھ میں ہے موجود
ہے تیری کرامت جو زیاں کو بھی کرے سود
تو باغِ براہیم، جہاں آتشِ نمرود

افسوں سے ترے قطرۂ خونِ سرِ مژگاں
ہے غیرتِ جاناں

سمجھے گا یہاں کون، ہے کیا نیک ہے بد کیا
اس گتھی کے سلجھانے میں حیراں ہے خرد کیا
اس زندگی و مرگ میں کیا جزر ہے مد کیا
ہستی ہے ابد کوش، ہے اس کی کوئی حد کیا

کچھ حسن ہے کچھ عشق ہے اس راز سے آگاہ
ہے راست یہی راہ

فانیؔ بدایونی

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

بھر لے نگہ آخر بے رنگ میں ہر رنگ
دنیا کو بھی لیتا ہوا دنیا سے گزر جا

فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

یوں نہ کسی طرح کٹی جب مری زندگی کی رات
چھیڑ کے داستانِ غم دل نے مجھے سلا دیا

موت تھی پہ وہ تہمت تھی کہ آساں نہ اٹھی
زندگی مجھ پہ وہ الزام کہ مشکل سے اٹھا

بھڑک کے شعلۂ گل تو ہی اب لگا دے آگ
کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا

وہ بدگماں کہ مجھے تابِ رنجِ زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غمِ جاوداں نہیں ملتا

شعبدے ایسے آنکھوں کے کتنے ہم نے دیکھے ہیں
آنکھ کھلی تو دنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا

اپنے کمالِ شوق پر حشر کا دن ہی منحصر وعدۂ دید چاہیئے زحمتِ انتظار کیا

خطاب روزِ حشر کی صدائے بازگشت ہوں
جواب بے سوال ہوں سوال بے جواب ہوں

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج تیرا نام لے کے کوئی غافل ہو گیا

ہم کو مرنا بھی میسر نہیں جینے کے بغیر موت نے عمرِ دو روزہ کا بہانا چاہا

تری جفا کے سوا بھی ہزار تھے انداز کوئی تو اہلِ وفا کا مزاج داں ہوتا

پاتا ہوں آج بھی خلش نوکِ خار میں بھولا نہیں ہوں لطفِ تبسم بہار کا
پھولوں سے کھیلتے ہی رہے آشیاں میں ہم آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا

اس کو بھولے تو ہوئے ہو فانیؔ کیا کرو گے وہ اگر یاد آیا

عشق ہے تو حسن محجوب آپ اپنی ہی تمنا کیا خوب

طلبِ محض ہے سارا عالم — کوئی طالب ہے نہ کوئی مطلوب

نہ آ فریب کہ پروردۂ فنا ہوں میں — بنا ہے برق کے تنکوں سے آشیاں صیاد

نامراد اب بھی ہیں تک نامراد جیتے ہیں — سانس بن گیا اک اک نالہ نارسا ہو کر
اور بندے ہیں جن کو دعوئ خدائی ہے — تھی ہماری قسمت میں بندگی خدا ہو کر
بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے مرتے ہیں نہ جیتے ہیں — درد پر خدا کی مار دل میں رہ گیا ہو کر

روحِ اربابِ محبت کی لرز جاتی ہے — تو پشیمان نہ ہو اپنی جفا یاد نہ کر

جی ڈھونڈتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دور
اس آپ کی زمیں سے الگ آسماں سے دور

شاید میں درخورِ نگہِ گرم بھی نہیں
بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دور

ہے منع راہِ عشق میں دیر و حرم کا ہوش
یعنی کہاں سے پاس ہے منزل کہاں سے دور

تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

صور و منصور و طور ارے توبہ — ایک ہی تیری بات کا انداز

آج روزِ وصالِ فانی ہے — موت سے ہو رہے ہیں ناز و نیاز

کچھ نہ وحدت ہے نہ کثرت نہ حقیقت نہ مجاز — یہ ترا عالمِ مستی وہ ترا عالمِ ہوش

موت ہے ایک وقفۂ موہوم — زندگانی سے زندگانی تک

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا — بات پہنچی تری جوانی تک

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم — رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

یہ زندگی کی ہے رودادِ مختصر فانی — وجودِ دردِ مسلّم علاج نامعلوم

جیے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی

ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں

کیے جائیں گے دل کے خاتمے پر شکر کے سجدے

وفاؤں نے کیا ہے خونِ حسرت سے وضو برسوں

رک کے جو سانسیں آئیں گئیں مانا کہ وہ آہیں تھیں لیکن

آپ نے تیور کیوں بدلے آہوں میں کسی کا نام نہیں

دل سے کسی کی آنکھوں تک کچھ راز کی باتیں پہنچی ہیں

آنکھ سے دل تک آیا ہو ایسا تو کوئی پیغام نہیں

بہلا نہ دل نہ تیرگیٔ شامِ غم گئی　　یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں
وہ تین ہچکیوں میں دمِ نزع کہ گیا　　شرحِ درازِ زندگیٔ مختصر کو میں

دل وقفِ تپش ہی ہائے مگر وجہِ تپشِ دل کوئی نہیں
بسمل ہوں مگر کیوں بسمل ہوں فریاد کہ قاتل کوئی نہیں
کس زعم میں ہی اے رہروِ غم دھوکے میں نہ آنا منزل کے
یہ راہ بہت کچھ چھانی ہی اس راہ میں منزل کوئی نہیں
بس اُن پہ نہ ان کی یاد پہ ہی تقدیر کے کیا کیا پہلو ہیں
تدبیر سے حاصل کچھ بھی نہیں تدبیر سے غافل کوئی نہیں
خود حُسن کمالِ حُسن ہی یعنی حسنِ جہاں ہی کامل ہی
اور عشق مآلِ عشق ہی یعنی عشق میں کامل کوئی نہیں
ہستی ہی نہیں جو باطل ہو پھر فرقِ مجاز و حقیقت کیا
ہر عرضِ حقیقت ہی وہ حقیقت ہستیِ باطل کوئی نہیں
فانیؔ ہی وہ اک دیوانہ تھا جو موت سے پہلے مرجاتا
کیا ہوش کی کافر دنیا میں اس موت کے قابل کوئی نہیں

فانیؔ ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی　　سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

سُنتے تھے محبت آساں ہی واللہ بہت آساں ہی مگر
اس سہل میں جو دشواری ہی وہ مشکل سی مشکل بھی نہیں
جب ڈوبنے والے ڈوب چکے اور ساحل و دریا ایک ہوئے

پھر لطفِ امید و بیم کہاں دریا میں نہیں ساحل ہی نہیں

بہار لائی ہی پیغامِ انقلابِ بہار (خزاں) سمجھ رہا ہوں میں کلیوں کے مسکرانے کو

غلط انداز نگاہوں کو سنبھال میری گستاخ نگاہی کو نہ پوچھ

کافر صورت دیکھ کے منہ سے آہ نکل ہی جاتی ہی
کہتے کیا ہو اب کوئی اللہ کا یوں بھی نام نہ لے

اس کے سوا نہیں خبرِ آشیاں مجھے میں تھا اسیرِ دام تو بجلی چمن میں تھی

مری آنکھوں میں آنسو تجھ سے ہمدم کیا کہوں کیا ہی
ٹھہر جائے تو انگارہ ہی بہ جائے تو دریا ہی
اسی کو تم مگر ای اہلِ دنیا جان کہتے ہو
وہ کانٹا جو مری رگ رگ میں رہ رہ کر کھٹکتا ہی

اجل بس ایک ہی کانٹا نکال کر چل دی ٹھہر کہ خارِ تمنا ابھی کھٹکتا ہی

نگاہِ ناز و سوزِ عشق دونوں ایک ہیں لیکن کہیں ہوتی ہی یہ بجلی کہیں معلوم ہوتی ہی
عجب عالم ہی موجِ برق کے پہلو میں بادل کا نری الٹی ہوئی سی آستیں معلوم ہوتی ہی

گناہ گار کی حالت ہے رحم کے قابل　　عجیب کشمکش جبر و اختیار میں ہے

اچھا یقین نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ　　ایک تو ہی ناخدا نہیں ظالم خدا بھی ہے

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قید و حیات　　مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

دنیا مری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے　　موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے
جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا　　جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے
آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے　　دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے
دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم　　بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے
فانیؔ جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

اک فسانہ سن گئے اک کہہ گئے　　میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے

دل کھوئے ہوئے برسوں گزر رہے ہیں مگر اب بھی
آنسو نکل آتے ہیں جب دل نظر آتا ہے
موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانیؔ
گرداب کی ہر تہ میں ساحل نظر آتا ہے

پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا　　جب ذکر بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی

گل خزاں کے راز کا محرم نظر آیا مجھے
ہر تبسم پردہ دارِ غم نظر آیا مجھے

میں نے فانیؔ ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات
جب مزاجِ دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے

دو گھڑی کے لیے میزانِ عدالت ٹھیرے
کچھ مجھے حشر میں کہنا ہے خدا سے پہلے

موج نے ڈوبنے والوں کو بہت کچھ پلٹا
رُخ مگر جانبِ ساحل نہیں ہونے پاتے

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لیے جاتا ہے
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

جل رہے ہیں آج تک دل کے چراغ
طور پر اک شمع جل کر رہ گئی

فصلِ گل جو یاد آئی آشیاں بھی یاد آیا
فصلِ گل میں اُجڑا تھا شاید آشیاں اپنا

مزاجِ دہر میں اُن کا اشارہ پائے جا
جو ہو سکے تو بہر حال مسکرائے جا

یاد ہی وہ نومیدی میں ہلکی سی جھلک اُمیدوں کی
ہائے وہ دل کے ویرانے پر دھوکہ سا آبادی کا

یاس و اُمید سے کام نہ نکلا دل کی تمنا دل میں رہی
ترکِ تمنا کر نہ سکے اظہارِ تمنا ہو نہ سکا

جن میں تمھارا نور رہا تھا اُن میں اندھیرا رہتا ہی
جب سے گئے ہو آنکھوں میں آنسو تو بہت ہیں نور نہیں

اگلے برس کے پھولوں کا کیا حشر اُنھیں معلوم نہیں
کلیوں کا یہ طرزِ تبسم یہ شادابی کیا کہیے

حرفِ تمنّا بے معنی سا نقشِ وفا سو دھندلا سا
دل کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہی دل کی حقیقت کیا کہیے
حشر بھی گزرا حشر میں بھی یہ سوچ کے ہم نے کچھ نہ کہا
غم کی حکایت کون سنے گا غم کی حکایت کیا کہیے

کیا عمر میں اک آہ بھی بخشی نہیں جاتی   اک سانس بھی کیا آپ کے ناکام نہ لیتے

مجاز مرحوم

اللہ رے سکونِ قلب اس کا دل جس نے لاکھوں توڑ دیئے
جس زلف نے دُنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی
دل کی یہ ویرانی بھی عجب ہی وہ بھی آخر کیا کرتے
جب دل میں اُن کے رہتے بستے یہ ویرانی کم نہ ہوئی
انسان کی ساری ہستی کا مقصود ہی فانیؔ ایک نظر
یعنی وہ نظر جو دل میں اُتر کر زخم بنی مرہم نہ ہوئی

فراق گورکھپوری

آج کی دنیا

دُنیا کو انقلاب کی یاد آ رہی ہے آج
تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے آج

وہ سر اٹھائے موجِ فنا آ رہی ہے آج
موجِ حیات موت سے ٹکرا رہی ہے آج

کانوں میں زلزلوں کی دھمک آ رہی ہے آج
ہر چیز کائنات کی تھرّا رہی ہے آج

جھپکا رہی ہے دیر سے آنکھیں ہوائے دہر
کون و مکاں کو نیند سی کچھ آ رہی ہے آج

ہر لفظ کے معانی و مطلب بدل چکے
ہر بات اور بات ہوئی جا رہی ہے آج

یکسر جہانِ حُسن بھی بدلا ہوا سا ہے
دُنیائے عشق اور نظر آ رہی ہے آج

ہر ہر شکستِ ساز میں صد لحنِ سرمدی
یا زندگی کے گیت اجل گا رہی ہے آج

یہ دامنِ اجل ہے کہ تحریکِ غیب ہے
کیا شے ہوائے دہر کو سُلگا رہی ہے آج

دُنیائے دہر لیتے ہیں یوں سانس گرم و تیز
سینے میں جیسے دیر ہوئی جا رہی ہے آج

افلاک کی جبیں بھی شکن در شکن سی ہے
تیوری زمین کی بھی چڑھی جا رہی ہے آج

پھر چھیڑتی ہے موت حیاتِ فسردہ کو
پھر آتشِ خموش کو اکسا رہی ہے آج

برہم سا کچھ مزاجِ عناصر ہے ان دنوں
اور کچھ طبیعت اپنی بھی گھبرا رہی ہے آج

اک موجِ درد سینے میں لرزاں ہے اس طرح
ناگن سی جیسے شیشے میں لہرا رہی ہے آج

بیتے جُگوں کی چھاؤں ہے امروز پر فراق
ہر چیز اک فسانہ ہوئی جا رہی ہے آج

دل ہیں اُٹھا کے رکھے گلستاں — کیسے علاجِ تشنگیٔ داماں
شبنم و شعلۂ حسنِ گلستاں — پرنم پرنم سوزاں سوزاں
آ گئے گُنہگارانِ محبت — نادم نادم نازاں نازاں
یہ بھی فسانہ وہ بھی کہانی — کیا شبِ وصل اور کیا شبِ ہجراں
آنچ قفس والوں تک آئی — اب کے بہت ہے شورِ بہاراں
کس کے پاؤں کی چاپ ہے دُنیا — کون ہے صبحِ ازل سے خراماں
کس نے موت کی نیند اُڑا دی — جاگ اُٹھی ہے خاکِ شہیداں

یوں ہی فراقؔ نے عمر بسر کی
کچھ غمِ جاناں کچھ غمِ دوراں

حیات بھی نہ ہو معراجِ آسمان و زمیں — مرا وجود بھی میرا وجود ہے کہ نہیں
جو بھولتی بھی نہیں یاد بھی نہیں آتیں — تری نگاہ سے کیوں وہ کہانیاں نہ کہیں
لبِ نگار رہیں یا نغمۂ بہار کی لو — سکوتِ ناز ہے یا کوئی مطربِ رنگیں
اگر بدل نہ دیا آدمی نے دُنیا کو — تو جان لو کہ یہاں آدمی کی خیر نہیں
شروعِ زندگیٔ عشق کا وہ پہلا خواب — تمھیں بھی بھول چکا ہے ہمیں بھی یاد نہیں
ہر انقلاب کے بعد آدمی سمجھتا ہے — کہ اس کے بعد نہ پھر لے گی کروٹیں یہ زمیں
اُٹھی فضاؤں میں تو انقلاب پلٹا ہے — زمیں بھی پھری ہوئی ہی فلک بھی چیں بہ جبیں
بس اک فسانہ یہ اندازِ عشق و شانِ جمال — بس ایک خوابِ پریشاں یہ شورش و تمکیں
ہر اک ابد کا مسافر ہر ایک خانہ بدوش — سپرد کیا یہ محبت کوئی مکاں نہ مکیں
نگاہِ ناز تری کافری کو پا نہ سکے — ہزار قبلۂ ایماں ہزار کعبۂ دیں
وہ جس نے اہلِ محبت کے ہوش اڑائے تھے — نگاہِ ہوش رُبا تھی نہ گیسوئے مشکیں

ہزار شکر کہ مایوس کر دیا تو نے — یہ اور بات کہ تجھ سے بڑی امیدیں تھیں
جھپک جھپک سی گئی ہے بہارِ لالہ و گُل — تری نگاہ سے چنگاریاں سی کچھ جو اڑیں
خدا کے سامنے میرے قصوروار ہیں جو — برابر اُن سے نگاہیں مری نہیں ہوئیں
مزاجِ عشق کو لازم ہے اب بدل جانا — کہ کچھ دلوں سے تو سنتے ہیں حسن بھی ہے حزیں
ہنر تو خیر ہنر عیب سے بھی جلتے ہیں
فغاں، کہ اہلِ زمانہ ہیں کس قدر کم ہیں

پھڑک کر حسنِ عالم، عالمِ وحدت نہ ہو جائے — کہیں دنیا کی ہر صورت تری صورت نہ ہو جائے
تری آنکھیں زمانے کے بدلنے کی کہانی ہیں — محبت بھی انھی آنکھوں کی کیفیت نہ ہو جائے
بجائے خلد وعدہ رکھ بھروسا سچی دنیا پر — مراد مند جو دنیا رشکِ صد جنت نہ ہو جائے
ہزاروں مشعلیں گُل کر چلا ہے وقت کا دامن — ترا یہ نورِ ایماں سر بسر ظلمت نہ ہو جائے
محبت میں بدلتا جا رہا ہوں پھر بھی ڈرتا ہوں
فراق آغاز میں جو تھی وہی حالت نہ ہو جائے

آج بھی کام محبت کے بہت نازک ہیں — دل وہی کارگہِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا
ظلمت و نور میں کچھ بھی نہ محبت کو ملا — آج تک ایک دھندلکے کا سماں ہے کہ جو تھا
منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں — وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا
دیکھ سکنے کی الگ بات مگر حسن ترا — دولتِ دیدۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا

کر عمرِ گزشتہ کو شریکِ غمِ امروز — خاکسترِ ماضی سے کچھ اٹھا ہے دھواں بھی

جینے والے جی لیں گے اب نہ ملو گے اچھی بات

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

× جہاں بھی جستجوئے یار میں ٹھہر جاتے یقین جان کہ منزل قریب ہی ہوتی

چپ ہو گئے تیرے رونے والے دُنیا کا خیال آگیا ہے

یہ بزم عام بھی ای دوست بزم عام نہیں
نگاہیں اُٹھتی ہیں لیکن کسی کسی کے لیے

+ دوزخ میں اور آئی قیامت جب یہ کھلا جنت بھی یہی ہے

غم حیات وہی دورِ کائنات وہی جو زندگی نہ بدل دے وہ زندگیا ہے

شبِ وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ ذرا ترے جمال کی معصومیاں نکھر آئیں

اک جنوں ساماں نگاہ آشنا کی دیر تھی
اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اُٹھتا ہے   بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں   تو نے تو خیر بے وفائی کی

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم
جو تیرے ہجر میں گزری وہ رات رات ہوئی

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہونے لگا
خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

خیال کو بے اثر نہ جانو عمل کی چنگاریاں ہیں اس میں
کہ آج ظلمت سرائے دل میں جو نور ہے کل وہ نار ہوگا

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی   یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

میں پوچھتا تو ہوں مگر جواب کے لیے نہیں
یہ کیوں تری نظر پھری یہ کیوں بدل گئی ہوا

فسردہ کیوں ہے چار بوند آنسوؤں میں کیا نہیں
حرارتیں نئی نئی طراوتیں نئی نئی

وہ سوز و درد مٹ گئے وہ زندگی بدل گئی
سوال عشق ہے ابھی یہ کیا کیا یہ کیا ہوا

بس ایک عشق سے خراب ہونے ہی کی دیر تھی
شباب تھا سنور گیا زمانہ تھا گزر گیا

کسی سے چھوٹ کے شاد اور کسی سے مل کے غمیں
فراق تیری محبت کا کوئی ٹھیک نہیں

جہاں کو دے گی محبت کی تیغ آب حیات ابھی کچھ اور اسے زہر میں بجھائے جا
اس اضطراب میں رازِ فروغ پنہاں ہے طلوع صبح کی مانند تھرتھرائے جا
نگاہِ یار ترا یوں تو ہے پیام کچھ اور مگر کرم بھی کیے جا ستم بھی ڈھائے جا

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی

فیض احمد فیضؔ

تنہائی

پھر کوئی یاد آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزر
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ

گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

موضوعِ سخن

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
دُھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سُنی جائے گی

اور ان ہاتھوں سے مس ہونگے یہ ترسے ہوئے ہاتھ
ان کا آنچل ہے کہ رخسار، کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

آج پھر حُسن دل آرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

اپنے افکار کی اشعار کی دنیا ہے یہی ۔ جانِ مضموں ہے یہی شاہدِ معنیٰ ہے یہی
۸

آج تک سُرخ و سیہ صدیوں کے سایہ کے تلے
آدم و حوّا کی اولاد پہ کیا گزری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی اجداد پہ کیا گزری ہے

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق ۔ کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے
یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا ۔ کس لیے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے

یہ ہر اک سمت پُر اسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ

یہ ہر اک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ

ہائے اس جسم کے کمبخت دل آویز خطوط!
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

ہم لوگ

دل کے ایواں میں لیے گُل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے اکتائے ہوئے
حُسنِ محبوب کے سیال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے
غایتِ سود و زیاں، صورتِ آغاز و مآل
وہی بے سود تجسس، وہی بے کار سوال
مضمحل ساعتِ امروز کی بے رنگی سے
یادِ ماضی سے غمیں، دہشتِ فردا سے نڈھال

تشنۂ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں
سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں
اک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
اور اک الجھی ہوئی موہوم سی درماں کی تلاش
دشت و زنداں کی ہوس، چاکِ گریباں کی تلاش

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

حسنِ فطرت

حسن جلباب عدم سے جو درخشاں نکلا — وجد میں کون و مکاں بنچو دورِ رقصاں نکلا
ہو جہاں گیر ضیا پاشیِ حسنِ تکوین — اب تو ارمان ترا عالمِ امکاں نکلا
جو سمجھتا ہے کہ انساں ہے ضعیف البنیان — ذہن سے اس کے نہ اندیشۂ شیطاں نکلا
حسن فطرت سے ہو انسان کی حسن آرائی — غازہ و عطر کا گل بوٹے پہ ساماں نکلا
حسن کا ہے یہ وفور اس کو نہ کہہ دل تنگی — رنگ بھی سینے سے غنچے کے پرافشاں نکلا

ہے گل حسن سے لبریز یہ دنیا کیفی
نظرِ قلب کا بھی تنگ ہی داماں نکلا

بسنت

دشت بنے ہیں گلستاں — کھیت ہیں کشتِ زعفراں
اٹھتی ہے آنکھ جس طرف — خلد نگاہ ہے سماں
آج ہوئی ہے کائنات — فیضِ بہار سے جواں

گل ہے کھلاتی کیا بسنت
زر ہے لٹاتی کیا بسنت

باغ نیا ہے بن نیا — گل کا ہے پیرہن نیا

پتوں کی پھبن نئی پھول کا بانکپن نیا
ہر کہیں ہے فضا نئی ہے فلکِ کہن نیا

طرّۂ حور ہے بسنت
رنگِ طور ہے بسنت

لو وہ بسنت آگئی قدرتِ حق دکھا گئی
آنکھوں میں بس گئی بسنت دل کی کلی کھلا گئی
راغ کو باغ- باغ کو رشکِ ارم بنا گئی

حور ہے اور پری بسنت
کیسی ہری بھری بسنت

ایک منظر

از مثنوی "جگ بیتی"

تھا اک مقام، فضا جس کی دل لبھاتی تھی
ادا سے جس کی پھبن دل میں بیٹھی جاتی تھی

سہانی لغزشیں مستانہ آبشاروں کی
وہ والہانہ لٹک چال جوئباروں کی

تھیں سبزوادیاں پیروں میں سر پہ اونچے پہاڑ
لدی پھندی ہوئی پھولوں سے جھاڑیاں اور جھاڑ

وہ کہکشاں کی سی پانی کی سبزے میں لہریں
کہ سبز مخمل پہ تھیں سیماب کی چھٹی لہریں

زمین لال ہرے کھیت ان میں یوں پانی
کہ سرخ سینے پہ پٹنے کی آب داری تھی

تھا کوہسار کا دل چسپ یوں نشیب و فراز
کہ جیسے شیر و شکر ہو گئے ہوں ناز و نیاز

وہ راگ چشموں کے اور وہ ترانے نہروں کے
کہ پانی پانی تھے نغمے ہزاروں لہروں کے

وہ جھٹ پٹا بھی انوکھا تھا کوہساروں کا
وہاں سماں تھا ہونے کو اب رت جگا بہاروں کا

رواں تھی چشمے سے شفاف اک رسیلی چال
وہ اس کے پیچ و خم اور اس کی وہ ٹھمک کی چال

تھیں دل فریب نرالی ادائیں پانی کی
اڑائے پھرتی تھی اس کو ہوا جوانی کی

نسیم چلتی تو رک رک کے دھیمی دھیمی سی
شمیم دیتی تھی لپٹیں تو بھینی بھینی سی

آنند نرائن مُلّا

کام کی باتیں

وقت آیا کام کا کچھ کام کی باتیں کریں
تا بکے اپنے دلِ ناکام کی باتیں کریں

پھر افق پر ایک صبحِ نو ہے رشکِ لالہ زار
شمعِ افسردہ لیے کیا شام کی باتیں کریں

کارواں انساں کا ہے پھر زندگی کے موڑ پر
کب تک آخر سجدۂ ہر گام کی باتیں کریں

ہر نفس ہے تیز سے کچھ تیز تر رفتارِ زیست
اب ہمیں فرصت کہاں آرام کی باتیں کریں

خونِ انساں سے لبالب آج ہے جامِ حیات
کس زباں سے حافظ و خیام کی باتیں کریں

لکھ رہی ہے تیغِ خوں آشام تاریخِ جہاں
کس طرح ہم بزمِ مئے آشام کی باتیں کریں

زندگی کی تلخیوں سے پھیر کر کب تک نگاہ
شاہد و شمع و شراب و جام کی باتیں کریں

نغمہائے آشیاں ہونے لگے کانوں پہ بار
اب چمن میں مرغِ زیرِ دام کی باتیں کریں

زندگی نے توڑ ڈالے وہ پرانے بُت تمام
طاق تو ڈھونڈیں نئے اصنام کی باتیں کریں

پختگیٔ عقل اچھی ہے مگر بہتر ہے یہ
گاہے گاہے آرزوئے خام کی باتیں کریں

رفعتوں سے زیست کی بھی کچھ کلامِ جاں نواز
تا بکے سطحِ مذاقِ عام کی باتیں کریں

شیخ جی مُلّا پہ لعنت بھیجیے کافر ہے وہ
آئیے ہم آپ کچھ اسلام کی باتیں کریں

تڑپ شیشے کے ٹکڑے بھی اڑا لیتے ہیں ہیرے کی
محبّت کی نظر جلدی سے پہچانی نہیں جاتی

کرن مہتاب کی پھولوں میں جب تھی جانِ تسکیں تھی
یہی ذروں میں کیا آئی کہ موجِ اضطراب آئی

جفا صیاد کی اہلِ وفا نے رائگاں کر دی
قفس کی زندگی وقفِ خیالِ آشیاں کر دی

بھرم حسنِ حقیقت کا کوئی کھلنے نہیں دیتا
نظر جب سامنے آئی تجلی درمیاں کر دی

اب کوئی صدا میری صدا پر نہیں دیتا
آوازِ طرب اور تھی آوازِ فغاں اور

آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار
گزرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی

زیست کی راحتوں میں بھی غم نہ ترا بھلا سکے
لب سے ہنسے ہزار بار دل سے نہ مسکرا سکے

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

سختی زیست عشق سے دور نہ ہو سکی مگر
پھول تو کچھ کھلا دیے دامنِ کوہسار میں

آں زیست سے گھبرا کے کرنہ خونِ شباب
خزاں کے خوف سے رسوائی بہار نہ کر

مجاز

رات اور ریل

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نصف شب کی خامشی میں زیر لب گاتی ہوئی
ڈگمگاتی، جھومتی، سیٹی بجاتی، کھیلتی
وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی
جیسے موجوں کا تبسم جیسے جل پریوں کا گیت
ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی
نونہالوں کو سناتی میٹھی میٹھی لوریاں
نازنینوں کو سنہری خواب دکھلاتی ہوئی
ٹھوکریں کھا کر مچلتی، گنگناتی، جھومتی
سرخوشی میں رقص کے انداز دکھلاتی ہوئی
ناز سے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم
اک دلہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی
رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی، کانپتی
پٹڑیوں پر دور تک سیماب جھلکاتی ہوئی
جیسے آدھی رات کو نکلی ہو اک شاہی برات
شادیانوں کی صدا سے وجد میں آتی ہوئی

منتشر کرتے فضا میں جابجا چنگاریاں
دامنِ موجِ ہوا میں پھول برساتی ہوئی

تیز تر ہوتی ہوئی منزل بہ منزل دم بدم
رفتہ رفتہ اپنا اصلی روپ دکھلاتی ہوئی

سینۂ کہسار پر چڑھتی ہوئی بے اختیار
ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی

ایک ستارہ ٹوٹ کر جیسے رواں ہو چرخ سے
رفعتِ کہسار سے میدان میں آتی ہوئی

اک بگولے کی طرح بڑھتی ہوئی میدان میں
جنگلوں میں آندھیوں کا زور دکھلاتی ہوئی

رعشہ بر اندام کرتی انجمِ شب تاب کو
آشیاں میں طائرِ وحشی کو چونکاتی ہوئی

یاد آ جائے پرانے دیوتاؤں کا جلال
ان قیامت پیکروں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی

ایک رخشِ بے عناں کی برق رفتاری کے ساتھ
خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی

پل پہ دریا کے دمادم کوندتی للکارتی
اپنی اس طوفان انگیزی پہ اتراتی ہوئی

پیش کرتی بیچ ندی میں چراغاں کا سماں
ساحلوں پر ریت کے ذروں کو چمکاتی ہوئی

مرغزاروں میں دکھاتی جوئے شیریں خرام
وادیوں میں ابر کے مانند اٹھلاتی ہوئی

اک پہاڑی پر دکھاتی آبشاروں کی جھلک
اک بیاباں میں چراغِ طور دکھلاتی ہوئی

جستجو میں منزلِ مقصود کے دیوانہ وار
اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی

چھیڑ دیتی وجد کے عالم میں سازِ سرمدی
غیظ کے عالم میں مُنہ سے آگ برساتی ہوئی

رینگتی، مڑتی، مچلتی، تلملاتی، ہانپتی
اپنے دل کی آتشِ پنہاں کو بھڑکاتی ہوئی

خود بخود روٹھی ہوئی بپھری ہوئی بکھری ہوئی
شورِ پیہم سے دلِ گیتی کو دھڑکاتی ہوئی

مارتی جاتی برابر منزلوں پر منزلیں
ایک اک لمحے میں کوسوں کی خبر لاتی ہوئی

آگے آگے جستجو آمیز نظریں ڈالتی
شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی

ایک مجرم کی طرح سہمی ہوئی سمٹی ہوئی
ایک مفلس کی طرح سردی میں تھراتی ہوئی

تیزیٔ رفتار کے سکے جماتی جابجا
دشت و در میں زندگی کی لہر دوڑاتی ہوئی

ڈال کر گزرے مناظر پر اندھیرے کا نقاب
اک نیا منظر نظر کے سامنے لاتی ہوئی

صفحۂ دل سے مٹاتی عہدِ ماضی کے نقوش
حال و مستقبل کے دلکش خواب دکھلاتی ہوئی

ایک سرکش فوج کی صورت علم کھولے ہوئے
ایک طوفانی گرج کے ساتھ دراتی ہوئی
ایک اک حرکت سے انداز بغاوت آشکار
بے دھڑک آزادیوں کے زمزمے گاتی ہوئی
ڈالتی بے حس چٹانوں پر حقارت کی نظر
کوہ پر ہنستی فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی
دامن تاریکیٔ شب کی اڑاتی دھجیاں
قصر ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی
زد میں کوئی چیز آجاتی تو اس کو پیس کر
ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی
زعم میں پیشانیٔ صحرا پہ ٹھوکر مارتی
پھر سبک رفتاریوں کے ناز دکھلاتی ہوئی
الغرض اڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعر آتش بیاں کا خون کھولاتی ہوئی

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

انتخاب جدید

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میری چھاتی پر مگر چلتی ہوئی شمشیر سی
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

راستے میں رک کے دم لے لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہم نوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں

اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے نوچ لوں
ای غمِ دل کیا کروں، ای وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
ای غمِ دل کیا کروں، ای وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا ہے سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
ای غمِ دل کیا کروں ای وحشتِ دل کیا کروں

....
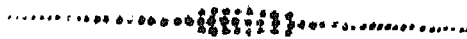
سید مقبول حسین احمد پوری

چھائی گھٹا گھنگھور

کالے کالے بادل آئے چھائے چاریوں اور
سکھی ری چھائے چاریوں اور
ہوا چلے اور بوندا برسیں، بن میں ناچے مور
سکھی ری بن میں ناچے مور
چھائی گھٹا گھنگھور سکھی ری چھائی گھٹا گھنگھور

اندر لوک میں باجا باجے ہوا مچاوے شور
سکھی ری ہوا مچاوے شور
کالی کالی رات ڈراوے جیا گھبراوے مور
سکھی ری جیا گھبراوے مور
چھائی گھٹا گھنگھور سکھی ری چھائی گھٹا گھنگھور

رات اندھیری پہاڑے کاٹا وے کیسے ہووے بھور
سکھی ری کیسے ہووے بھور
موسیقی کوئی گیت سناوے گلا سہانا تور
سکھی ری گلا سہانا تور
چھائی گھٹا گھنگھور سکھی ری چھائی گھٹا گھنگھور

رنگ بسنتی چھائے

گیہوں کھیتوں پھولی سرسوں رنگ بسنتی چھائے
پھول کسم کے کھیت کنارے کیسر گوٹ لگائے
اسی سمے اے پریمی من کو پریم کی بات سہائے
پھولی سرسوں، آئی ہولی، رنگ بسنتی چھائے

تھال میں پھول اور پات لیے کوئی سوہنے مندر وا جائے
چھمک چھمک چل جب دکھلا دے پتھر کو شرمائے
سکھ آنند سمے سمپورن پھر یہ سمے نہ آئے
پھولی سرسوں، آئی ہولی، رنگ بسنتی چھائے

آشا میری سن لو سوامی، دن دونی ہو جائے
اور یہ شوبھا موری پی کی آنکھوں میں کھب جائے
اور اے سوامی اب کے آؤں پالک گلے لگائے
پھولی سرسوں، آئی ہولی رنگ بسنتی چھائے

کوئی کہے اے سوامی مجھ کو گیان کی بات نہ بھائے
برس دنا ہونے کو آئے شام سے پریت لگائے
کب تک راکھوں من کو اپنے سوامی جی لگائے
پھولی سرسوں، آئی ہولی، رنگ بسنتی چھائے

جوہی اپنی کتھا سنائے اپنی بپتا گائے
دیکھوں سوامی کیسے سر اپنا کوئی سامن لٹکائے
سوامی جی میری بھی سن لو میں بھی آس لگائے

پھولی سرسوں آئی ہولی رنگ بسنتی چھائے
پوت سپوت نہ مانگو سوامی مایا مجھے نہ بھائے
اس جگ کی سب شو بھا جھوٹی اس پر دھیان نہ جائے
اپنا مجھے بنا لو سوامی رووں سیں نواسے
پھولی سرسوں آئی ہولی رنگ بسنتی چھائے

نین کٹاری

سن تو سکھی میں تجھ پر واری مجھ کو دیکھ ہنسیں نرناری
میں تو تن من دھن سب ہاری
ہردے لاگی نین کٹاری
کل اشنان کیا جو میں نے کوٹھا چھوڑ چڑھی اٹاری
دیکھی صورت سانوری پیاری
ہردے لاگی نین کٹاری
ہاتھ سے میں نے بال نچوڑے کنگھی سے کے مانگ نکالی
پہن رہی تھی صندل ساری
ہردے لاگی نین کٹاری
سکھی بتا کچھ تو جگ کھیلی نئی نویلی میں دکھیاری
مار گیو موکو گردھاری
ہردے لاگی نین کٹاری

منظور حسین صاحب ماہر القادری

نیند کے مارے ایک دوشیزہ آنکھیں ملتی جاتی ہے

چاند کی رنگت پھیکی سی ہے رات بھی ڈھلتی جاتی ہے
شمع بھی سوز دل کے ہاتھوں رنگ بدلتی جاتی ہے
سانس کی تیزی کیا کہیے تلوار سی چلتی جاتی ہے
بادِ صبا ٹھوکر کھا کر ہر بار سنبھلتی جاتی ہے
نیند کے مارے اک دوشیزہ آنکھیں ملتی جاتی ہے

نظم بھی ہے غزلیں بھی ہیں اور گیت بھی ہے تقریر بھی ہے
پھول بھی ہے انگارے بھی ہیں پارا ہے اکسیر بھی ہے
موسیقی کے زیر و بم ہیں اور ان میں تاثیر بھی ہے
نغمے کے طوفانوں میں ہر سانس جھکولے کھاتی ہے
نیند کے مارے اک دوشیزہ آنکھیں ملتی جاتی ہے

ماتھے کی نمناک لکیریں نور کا مینہ برساتی ہیں
ہونٹ ہیں گویا کچی کلیاں آنکھیں کچھ کچھ گاتی ہیں
خود ہی خود غزلوں پہ غزلیں موزوں ہوتی جاتی ہیں
زلف کی بے ترتیبی رخ پر اور قیامت ڈھاتی ہے
نیند کے مارے اک دوشیزہ آنکھیں ملتی جاتی ہے

صبح بہاراں

کانٹوں کی نوکیں رشکِ گُلِ تر
پھولوں کا جوبن اللہ اکبر
ہر برگ رنگیں ہر گل معطّر
دل کش تماشا دل چسپ منظر
صبح بہاراں

کلیوں کی چاندی شبنم کے گوہر
کرنوں کا سونا پھولوں کے زیور
کونپل کے جگنو پتوں کے جھومر
ہر چیز روشن ہر شے منور
صبح بہاراں

غنچوں کے نیچے سبزے کی مخمل
پھولوں کی جھالر شاخوں کا آنچل
آبِ رواں کی باریک ململ
چمپا کا پٹکا بیلے کی جدول
صبح بہاراں

جنگل کی نزہت خاشاک و خس میں
کوثر کی موجیں پھولوں کے رس میں
کلیوں کی سیجیں کنجِ قفس میں
سارا زمانا مستی کے بس میں

صبح بہاراں

بادِ سحر کیا اٹھلا رہی ہے

پھولوں کے تلوے سہلا رہی ہے

خنکی دلوں کو گرما رہی ہے

سینے میں اُن کی یاد آ رہی ہے

صبح بہاراں

چودھری خوشی محمد خاں ناظرؔ

"جوگی اور ناظر"

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا

مستانہ ہوائے گلشن تھی جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادیٔ ایمن تھی ہر کوہ پہ جلوۂ طور ہوا

جب بادِ صبا مضراب بنی ہر شاخِ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار بنے ہر سرو و چمن طنبور ہوا

سب طائر مل کر گانے لگے عرفان کی تانیں اڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے دل کش وہ سماع طیور ہوا

سبزے نے بساط بچھائی تھی اور بزمِ سرور رچائی تھی
بن میں گلشن اور آنگن میں فرشِ سنجاب و سمور ہوا

تھا دل کش منظر دشت و جبل اور چال صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظرؔ دیوانہ

چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے پربت پر چھاؤنی چھائی تھی
تھے خیمے ڈیرے بادل کے کہرے نے قنات لگائی تھی

یاں برف کے تودے گلتے تھے چاندی کے فوارے چلتے تھے
چشمے سیماب اگلتے تھے نالوں نے دھوم مچائی تھی

یاں قلعۂ کوہ پہ رہتا تھا اک مست قلندر بیراگی
تھی راکھ جٹوں میں جوگی کی اور انگ بھبوت رمائی تھی
تھا راکھ کا جوگی کا بستر اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیب کمر جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی
سب خلق خدا سے بیگانہ وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ آنکھوں میں مستی چھائی تھی
جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں اور جھک کر ہم نے سلام کیا
تب آنکھ اٹھا کر ناظر سے یوں بن باسی نے کلام کیا

کیوں بابا ناحق جوگی کو تم کس لیے آ کے ستاتے ہو
میں پنکھ پکھیرو بن باسی تم جال میں آن پھنساتے ہو
کوئی جھگڑا دال چپاتی کا کوئی دعویٰ گھوڑے ہاتھی کا
کوئی شکوہ سنگی ساتھی کا تم ہم کو سنانے آتے ہو
ہم حرص ہوا کو چھوڑ چکے اس نگری سے منہ موڑ چکے
ہم جو زنجیریں توڑ چکے تم لا کے وہی پہناتے ہو
تم پوجا کرتے ہو دھن کی ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی
ہم جوت جگاتے ہیں من کی تم اس کو آ کے بجھاتے ہو
سنسار سے یاں مکھ پھیرا ہے من میں ساجن کا ڈیرا ہے
یاں آنکھ لڑی ہے پیتم سے تم کس سے آنکھ ملاتے ہو
اس مست قلندر جوگی نے جب ناظر پر یہ عتاب کیا
کچھ دیر تو ہم خاموش رہے پھر جوگی سے یہ خطاب کیا

ہیں ہم پردیسی سیلانی مت ناحق طیش میں آ جوگی
ہم آ کے تھکے تیرے درشن کو چتون پہ مل مت لا جوگی
آبادی سے منہ پھیرا کیوں پربت میں کیا ہے ڈیرا کیوں
ہر محفل میں ہر منزل میں ہر دل میں ہے نور خدا جوگی
کیا مسجد میں کیا مندر میں سب جلوہ ہے وجہ اللہ کا
پربت میں نگر میں ساگر میں ہر اترا ہے ہر جا جوگی
جی شہر میں خوب بہلتا ہے واں حسن پہ عشق مچلتا ہے
واں پریم کا ساغر چلتا ہے چل دل کی پیاس بجھا جوگی
واں دل کا غنچہ کھلتا ہے ہر رنگ میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی بازار میں دھونی رما جوگی

ان چکنی چپڑی باتوں سے مت جوگی کو پھسلا بابا
جو آگ بجھائی جتنوں سے پھر اس پہ نہ تیل گرا بابا
ہے شہروں میں غل شور بہت اور کام کرودھ کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت سادھو کی ہے بن میں جا بابا
ہے شہروں میں شورش نفسانی جنگل میں ہے جلوہ نورانی
ہے نگری ڈگری کثرت کی بن وحدت کا دریا بابا
ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں چشموں سے پیاس بجھاتے ہیں
راجا کے نہ دوارے جاتے ہیں پرجا کی نہیں پروا بابا
سر پر آکاش کا منڈل ہے دھرتی پہ سہانی مخمل ہے
دن کو سورج کی محفل ہے شب کو تاروں کی سبھا بابا

جب جھوم کے یاں گھن آتے ہیں مستی کا رنگ جماتے ہیں
چشمے طنبورہ بجاتے ہیں گاتی ہے ملار ہوا بابا

ہاں پنچھی مل کر گاتے ہیں پریتم کی سندیس سناتے ہیں
یاں روپ انوپ دکھاتے ہیں پھل پھول اور برگ گیا بابا

ہے پیٹ کا ہر دم دھیان تمھیں اور یاد نہیں بھگوان تمھیں
سل پتھر اینٹ مکان تمھیں دیتے ہیں سکھی سے جھگڑا بابا

تم من کو دھن میں لگاتے ہو پریتم کو دل سے بھلاتے ہو
ماٹی میں لعل گنواتے ہو تم بندۂ حرص و ہوا بابا

دھن دولت آنی جانی ہے یہ دنیا رام کہانی ہے
یہ عالم عالم فانی ہے باقی ہے ذات خدا بابا

علی حیدر نظم طباطبائی

گورِ غریباں

وداع روز روشن ہے گجر شام غریباں کا
چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے
قدم گھر کی طرف کس شوق سے اٹھتا ہے دہقاں کا
یہ ویرانہ ہے میں ہوں اور طائر آشیانوں کے

اندھیرا چھا گیا دنیا نظر سے چھپتی جاتی ہے
جدھر دیکھو اُٹھا کر آنکھ ادھر اک ہو کا ہے عالم
مگس لیکن کسی جا بھیرویں بے وقت گاتی ہے
جرس کی دور سے آواز آتی ہے کبھی پیہم

کبھی اک گنبد کہنہ پہ بوم خانماں ویراں
فلک کو دیکھ کر شکووں کا دفتر باز کرتا ہے
کہ دُنیا سے الگ اک گوشۂ عزلت میں ہوں پنہاں
کوئی پھر کیوں قدم اس کنج تنہائی میں دھرتا ہے

قطار اک سامنے ہے مولسریوں کے درختوں کی

وہاں قبریں بنی ہیں مٹی کے جیسے ڈھیر ہوتے ہیں
ہر اک نے مر کے بس دو گز کفن گز بھر زمیں پائی
بسانے والے جو اس گاؤں کے تھے سب وہ سوتے ہیں

نفس بادِ سحر کا نالۂ پر درد بلبل کا
ہوئے بے کار سب ان کو اٹھا سکتا نہیں کوئی
رہی بے فائدہ مستوں کی ہو حق شور قلقل کا
ہیں ایسے نیند کے ماتے جگا سکتا نہیں کوئی

نہ چولہے آگ روشن ہے نہ اب ان کے گھڑے پانی
نہ گھر والوں کو اب کچھ کام ہے فکر شبستاں سے
نہ بی بی کو سر شام انتظار اب ہے نہ حیرانی
نہ بچے دوڑتے ہیں اب کہ لپٹیں آکے دلہاں سے

وہی ہیں یہ جنھیں وقت درو ملتی نہ تھی دم بھر
وہی ہیں ہاتھ چلتے رہتے ہی تھے بیشتر جن سے
وہی ہیں یہ جنھوں نے ہل چلائے گیت گا گا کر
بڑے سرکش درختوں کو گراتے تھے تبر جن سے

نہ دیکھیں حال ان لوگوں کا ذلت کی نگاہوں سے
بھرا ہے جن کے سر میں غرۂ نوابی و خانی

یہ ان کا کاسۂ سر کہہ رہا ہے کج کلاہوں سے
عجب ناداں ہیں وہ جن کو ہے عُجب تاجِ سلطانی

نہیں شایان فخر و ناز و نوبت اور نقارہ
جو نازاں جاہ و ثروت پر ہیں ان پر موت ہنستی ہے
وہ ساعت آنے والی ہے نہیں جس سے کوئی چارہ
کہ فانی ہے جہاں، ہر اوج کا انجام پستی ہے

نظر آتے نہیں کتبے ہزاروں پر تو کیا غم ہے
چراغاں اور صندل اور گل و ریحاں نہ ہو تو کیا
نہیں شمگیر اور کمخواب کی چادر تو کیا غم ہے
جو خوش آہنگ کوئی قاری قرآں نہ ہو تو کیا

بناتے ہو بہو تصویر اگر مدفن پہ رکھنے کو
پلٹ کر اس سے کچھ نکلی ہوئی سانس آ نہیں سکتی
دعا ہو فاتحہ ہو مرثیہ ہو آہ و زاری ہو
کوئی آواز ان کے کان ہی تک جا نہیں سکتی

خدا جانے تھے ان لوگوں میں کیا کیا جوہر قابل
خدا معلوم ہوں گے بازوئے زور آزما کیسے
خدا ہی کو خبر ہے کیسے کیسے ہوں گے صاحب دل

خدا معلوم ہوں گے بازوئے زور آزما کیسے

زمانے نے مگر کوئی ورق ایسا نہیں الٹا
کہ باد فکر سے جسارت یہ پاتے سر اٹھانے کی
مصیبت نے طبیعت کی روانی کو کیا پسپا
کہ بار آنے نہ پائی جوہر ذاتی دکھانے کی

بہت سے گوہر شہوار باقی رہ گئے ہوں گے
کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہ میں سمندر کی
ہزاروں پھول دشت و در میں ایسے بھی کھلے ہوں گے
کہ جن کے مسکرانے میں تھی خوشبو مشک اذفر کی

بہت صاحب عزم ہیں گو رزم کی نوبت نہیں آئی
حکومت اپنے قریے ہی کی لیکن دوست دشمن پر
وہ فردوسی یہ ہیں جن کی زباں کھلنے نہیں پائی
وہ رستم ہیں نہیں سہراب کا خون جن کی گردن پر

مقدر نے انھیں مصروف رکھا قلبہ رانی میں
وگرنہ حکمرانی کا بھی جلوہ یہ دکھا دیتے
عجب کیا شہرۂ آفاق ہوتے خوش بیانی میں
اور اپنے کارنامے اہل عالم کو سنا دیتے

رہے مصروف نیکی میں بچے ہر اک برائی سے
نہ زورِ مردم آزاری نہ شورِ فتنہ انگیزی
نہ دولت کی طمع میں بے گناہوں کے گلے کاٹے
نہ کی خلقِ خدا کے ساتھ بے رحمی و خوں ریزی

نہ صحبت میں امیروں کی کبھی خونِ جگر کھایا
نہ اونٹایا لہو اپنا کبھی جھوٹی خوشامد سے
نہ کی کر روغنِ تازِ آتشِ نخوت کو بھڑکایا
کہ جس سے خودپسندوں کا تبختر بڑھ چلے حد سے

الگ ہر نیک و بد سے دُور دنیا کے مکائد سے
گئے بیگانہ وار اور خلق میں بیگانہ وار آئے
رہے محفوظ اپنے زمانہ کے مفاسد سے
قدم راہِ توکل سے کبھی ڈگنے نہیں پائے

نہ دیکھ ان استخوانہائے شکستہ کو حقارت سے
یہ ہے گورِ غریباں اک نظر حسرت سے کرتا جا
نکلتا ہے یہ مطلب لوحِ تربت کی عبارت سے
"جو اس رستے گزرتا ہے تو ٹھنڈی سانس بھرتا جا"

لکھے ہیں نام ان قبروں پہ گو کہ داک حرفوں میں

مگر بھولے ہوؤں کو ٹھیک رستہ یہ بتاتے ہیں
زیادہ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا اگر سوچیں
کہ جو مرنے سے ناواقف ہیں رستہ سیکھ جاتے ہیں

جو آیا ہے جہاں میں یاں سے جاتا ہے آخر اک دن
یہ ہوتا ہے کوئی چاہے گا دل سے یا نہ چاہے گا
مگر جاتے ہوئے پھر کر نہ دیکھے یہ نہیں ممکن
دلوں سے یاد بھی مٹ جائے یہ حاشا نہ جائے گا

کوئی زانو کسی کا ڈھونڈتا ہے دم نکلنے کو
کہ دیکھے اشک گرتے چاہنے والے کے دامن میں
کسی کو ہے یہ خواہش دوست کاندھا دیں جنازے کو
پھر اس پر فاتحہ کی آرزو ہے کنج مدفن میں

حقیقت غور سے دیکھی جو ان سب مرنے والوں کی
تو ایسا ہی نظر آنے لگا انجام کار اپنا
انھی کی طرح جیسے مل گئے ہیں خاک میں ہم بھی
یونہیں پرسان حال آنکلا ہے اک دوست دار اپنا

یہ اس سے ایک دہقان کہن سال آ کے کہتا ہے
کہ ہاں ہاں خوب ہم واقف ہیں دیکھا ہے اسے اکثر

پھر اس کے بعد دل ہی دل میں کچھ غم کھا کے کہتی ہے
کہ اب تک پھرتا ہے آنکھوں میں پھرنا اس کا سبزے پر

وہ اس کا نور کے تڑکے ادھر گلگشت کو آنا
وہ پو پھٹنے سے پہلے آ کے پھرنا سبزہ زاروں میں
وہ کچھ کم دن رہے اس کا لبِ جو کی طرف جانا
وہ اس کا مسکرانا دیکھ کر شور آبشاروں میں

کبھی ایسی ہنسی لب پر کہ ظاہر جس سے کچھ نفرت
اور اس کے ساتھ ہی کچھ زیر لب گنتے ہوئے جانا
کبھی تیوری چڑھائے منہ بنائے رنج کی صورت
کہ جیسے دل پہ صدمہ ہو زباں جس سے ہو بیگانہ

غرض کیا کیا کہوں اک روز کا یہ ذکر ہے صاحب
کہ اس میدان میں پھرتے صبح دم اس کو نہیں دیکھا
ہوا پھر دوسرا دن اور نظر سے وہ رہا غائب
خیاباں میں اسے پایا نہ دریا پر کہیں دیکھا

پر اس کے تیسرے دن دیکھتا کیا ہوں جنازے کو
لیے آتے ہیں سب پڑھتے ہوئے کلمہ شہادت کا
تمہیں پڑھنا تو آتا ہوگا آؤ پاس سے دیکھو

یہ اس کی قبر ہے اور یہ کتابہ سنگِ تربت کا

اب آغوش لحد میں سو رہا ہے چین سے کیسا
گیا افسوس لیکن یہ جواں ناکام دنیا سے
دکھایا جاہ و شہرت نے نہ بھولے سے بھی منہ اپنا
پھر ایسے نامرادوں کا بھلا کیا کام دنیا سے

ہر اک کے درد و دکھ سے اس کو رہتا تھا سدا مطلب
ہوا ممکن تو یاری کی نہیں تو اشک باری کی
دیا دستِ تہی کے ساتھ طینت میں کرم یارب
میں تیری شان کے قربان کیا اچھی تلافی کی

خدا بخشے اسے بس دوست کا رہتا تھا وہ جویا
تو نکلا دوست آخر اک خداوند کریم اس کا
اب اس کے نیک و بد کا ذکر کرنا ہی نہیں اچھا
کہ روشن ہے خدا پر عالمِ امید و بیم اس کا
(انگریزی شاعر گرے کی نظم کا آزاد ترجمہ)

انتخابِ غزلیات

ہنسی ہنسی میں وہ بات کہہ دی کہ رہ گئے آپ دنگ ہو کر

چھپا ہوا تھا جو رازِ دل میں کھلا وہ چہرے کا رنگ ہو کر
شباب و پیری کا آنا جانا غضب کا پُر درد ہو فسانہ
یہ رہ گئی بن کے گرد حسرت وہ اُڑ گیا رُخ سے رنگ ہو کر

کوچہ کوئی نکلے جو رگِ جاں سے قریں اور
اس گنبدِ بے در سے نکل چلیے کہیں اور

مجھے دوڑا رہا ہے شوق منزل کا یہ کہہ کر
کہ گرنا بار بار اچھا ہے اُٹھنا دم بدم اچھا

شادی اس نے ہستی آستینوں کو اگر اُلٹا
عدم کا اُٹھ گیا پردہ جو دامن تا کمر اُلٹا
نہ بھولیں گی کبھی وہ خلوتیں وہ عشق کی راتیں
کہ پردہ شام سے چھوڑا تو ہنگامِ سحر اُلٹا

یہ کس دھوکے میں جان اپنی دئے دیتے ہیں پروانے
انھوں نے شمع کے شعلے کو شاید تاج زر جانا
ذرا سی آبرو جو قطرۂ شبنم سے بھی کم تھی
سنا جوہر شناسوں سے اُسے آپ گہر جانا

سارے عالم کو بنایا ہدفِ تیرِ اجل
قادرِ انداز نے یہ فعل بھی کیا نہ کیا

آج گردوں میں کیا شہرۂ آفاق جسے
کل اُسے محفل احباب کا افسانہ کیا
الحذر ظلم بہت جھک کے فلک ملتا ہے
خوف کی بات ہے دشمن نے جو یارانہ کیا

ہستی کا شور تو ہے مگر اعتبار کیا
جھوٹی خبر کسی کی اڑائی ہوئی سی ہے
منزل اسے سمجھ کے کمر کھولتے ہیں ہم
بستی جو رہزنوں کی بسائی ہوئی سی ہے

خبر ہوئی جو دیجو دیہ دل کو کہ دہر دار الامان نہیں ہے
خوشی یہ کہہ کر ہوئی روانہ مرا ٹھکانا یہاں نہیں ہے

ادھر جوانی کی شام آئی ادھر ہوئی صبح عید پیری
یہ کیسی شام و سحر الٰہی کہ جس میں شب درمیاں نہیں ہے
اگرچہ ہے بے ثبات عالم ٹھہر کوئی دم تو او رشبنم
ترا قدم تو سبک ہے ایسا کہ برگِ گل پر گراں نہیں ہے

فضائے دہر میں ہم مثلِ برق آ کے چلے
تڑپ کے کاٹ دیا وقت مسکرا کے چلے
نمودِ رعشۂ پیری ہوا اجل آئی
چراغِ صبح تھے گویا کہ جھلملا کے چلے
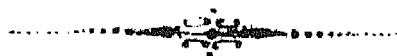
سیّد ہاشمی فرید آبادی

سُراغِ ہم

قدم نہیں قرار میں حیاتِ مستعار کا
کہ ہے اسیر ہر نفس ہوائے رہ گزار کا
مری زباں میں ہم سفر سیاحتیں ہیں منزلیں
مدام گشت و دشت ہے مقام شہسوار کا

نمائشِ جدید ہے ہر ایک پل حیات کی
جو آنکھ ہو تو دیکھ یاں نہ دن کی ہے نہ رات کی
مناظر وسیع ہیں عجب نہیں کہ موت بھی
اک اور راہِ سیر ہو نہفتہ کائنات کی

یہ جستجو ہی گمرہی کہ کیوں چلے کدھر چلے
ترا نصیب چرخ ہے پھرائے جا جدھر چلے
وہی نجوم باد پا بہت پرے نکل گئے
منازل و مدار سے جو رہ سکے بے خبر چلے

گھٹا جو جھومتی پھری شرارہ وار ہو گئی   خزاں پلٹ کے چلی گئی تو نو بہار ہو گئی

نہ انبساط سہیل سے کمال نا امید تھی گھلی غمِ جمود میں کہ جو تبا رہو گئی

کسی کو رنج سعی سے کمالِ انگبیں ملا
جہاد باغباں کا پھل کشادِ یاسمیں ملا
یہ مشتِ خاک دہر سے ہزار بار بس لڑی
دماغِ آدمی کو تب تمدنِ آفریں ملا

نہ ماحصل کی انتہا نہ محنتیں حدود میں
عمل کے ساتھ آ گئے نئے جہاں وجود میں
ہوس بھی شوقِ جہد کے لباس میں عزیز ہے
شکست خوردہ موج تک سدا رہی صعود میں

کشاکشِ دوام میں فراغتِ دوام ہے
ہنر شرف کرامتیں مشقتوں کا نام ہے
رکے نہ تیغِ جنگ جو سپاہ کوچ میں رہے
یہی صراطِ امن ہے یہی رہِ سلام ہے

سکوں کو عیش مت سمجھ فریبِ ماندگی ہے یہ
بسانِ صاعقہ تڑپ کہ زندگی ہے یہ
جنونِ پختہ کار کو تلاشِ جاوداں نصیب
نظر ہدائے دید پہ کمالِ بندگی ہے یہ

کالی ناگن

جو آدھی رات کی رانی ہے اور پرجا جس کی جاتی ہے
اک بانکا تاج دھرے سر پر وہ کالی ناگن آتی ہے
ہر اس کی ایک ایک چال میں گت ہے اس کی ساری چال نرت
ہر جنبش پر بالی کی کمر بل کھاتی لچکتی جاتی ہے

یا ہے وہ امنگ جوانی کی اور باہیں پھیلی ترتی ہے
یا موج ہے بہتے پانی کی اور البیلی گھُلی پھرتی ہے
کچھ شرم ہے کچھ خود آرائی ہے نشہ ہے کی انگڑائی
بن بن البیلی کھلتی ہے اٹھ اٹھ متوالی گرتی ہے

دو نین کٹورے زہر بھرے آنکھوں آنکھوں میں ڈستی ہے
جو آیا زد میں پھر نہ ملا وہ ظالم سحر کی بستی ہے
قاتل تیور، کافر چتون، اک کالی بجلی سارا بدن
یا کرشن کا اودا جوبن ہے یا پاربتی کی مستی ہے

وہ حسن سیہ کی بن کے سناں سینوں کے پار گزرتی ہے
پر آپ مہک پر ہے قرباں اور اپنے راگ پہ مرتی ہے
لف منہ میں ہیں مجنونانہ اور ساری ادائیں جانانہ
بے تاب ہے عشق کی سوزش سے دم دم پھنکارے بھرتی ہے

بجنوری مرحوم کی وفات

صبح کی آمد نہ تھی، ای دیدۂ ظلمت نصیب
وہ کسی فوق النظر تارے کی پہلی تھی کرن
اس فضائے پُر کدورت میں نہ تھا اس کا وطن

اب کہاں وہ نورِ شیریں.... ہاں مگر اس کی جھلک
ہی اگر باقی تو ہو شبنم کی نازک روشنی
یا سرِ شب کھلنے والی موتیا کی چاندنی

حُسنِ مستتر

وہ دن بھی ای گُل تو خاستہ ہیں یاد ہے تجھے
چمن میں جب کہ ترا کوئی بے قرار نہ تھا
گیاہ و برگ پیا سے تری مہک کے نہ تھے
طیور کو ترے جلوے سے اضطرار نہ تھا
چھپی ہوئی تھی شگوفے میں رنگ و بو تیری
ترے جمال کا عالم میں اشتہار نہ تھا

کہا یہ پھول نے شرما کے نکتہ چیں خاموش
کہ ہم کو اپنے نہ کھلنے کا اختیار نہ تھا

یاسؔ (یگانہ) چنگیزی عظیم آبادی

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا — خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا
پیامِ زیرِ لب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا — اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا
سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد — سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا
بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا — خدا کے گھر تو کوئی بندۂ خدا نہ گیا

ابھی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی دور
اس آج کل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا
پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا
بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زور پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں تھی
مزاج اس دلِ بے اختیار کا نہ ملا
امیدوار رہائی قفس بدوش چلے
جہاں اشارۂ توفیق نا رسا نہ ملا
ہوائے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا
سمجھ میں آ گیا جب عذرِ فطرتِ مجبور
گناہ گارِ ازل کو نیا بہانہ ملا
بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بد نصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

مزہ گناہ کا جب تھا کہ باوضو کرتے
بتوں کو سجدہ بھی کرتے تو قبلہ رو کرتے
ازل سے جو کششِ مرکزی کے تھے پابند
ہوا کی طرح وہ کیا سیرِ چار سو کرتے
ازالۂ دل کی نجاست کا اور کیا ہوتا
جلا کے خاک نہ کرتے تو کیا لہو کرتے

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی
کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا
پیالہ خالی اٹھا کر لگا لیا منہ سے
کہ یاسؔ کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا

کیا خبر تھی دل سا شاہنشاہ آخر ایک دن
عشق کے ہاتھوں گداؤں کا گدا ہو جائے گا

بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دستِ ہوس
گھٹتے گھٹتے ایک دن دستِ دُعا ہو جائے گا

قفس میں بوئے مستانہ بھی آئی دردِ سر ہو کر
نوید ناگہاں پہنچی ہے مرگِ منتظر ہو کر

کہاں پر نارسائی کی ہے پروانوں کی قسمت نے
پڑے ہیں منزلِ فانوس پر بے بال و پر ہو کر

جواب آیا تو کیا آیا صدائے بازگشت آئی
دہن سے آہ نکلی مبتدائے بے خبر ہو کر

فلک کو دیکھتا ہوں اور زمیں کو آزماتا ہوں
مسافر در وطن خانہ بدوش آوارہ گزر ہو کر

نگاہِ یاس کا عالم جو آگے تھا وہ اب بھی ہے
ہزاروں گل کھِلے بازیچۂ شام و سحر ہو کر

خاک کا پتلا ہے رفتارِ نمو سے مجبور
ہمہ تن سنگ بنے یا ہمہ تن دل ہو جائے

ناخدا کو نہیں اب تک تہِ دریا کی خبر
ڈوب کر دیکھے تو بیگانۂ ساحل ہو جائے

کعبے کی طرف دور سے سجدہ کر لوں — یا دہر کا آخری نظارہ کر لوں
کچھ دیر کی مہماں ہے جاتی دنیا — اک اور گنہ کر لوں کہ توبہ کر لوں

چارہ نہیں کوئی جلتے رہنے کے سوا — سانچے ہیں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع تری حیاتِ فانی کیا ہے — جھونکا کھانے سنبھلتے رہنے کے سوا

موجوں سے لپٹ کے پار اُترنے والے — طوفانِ بلا سے نہیں ڈرنے والے
کچھ بس نہ چلا تو جان پر کھیل گئے — کیا چال چلے ہیں ڈوب مرنے والے

بے درد دعا مانگنے والا تو کون؟ — کیوں میرے سوا مانگنے والا تو کون؟
ہنستا ہوں خود اپنے حال پر میرے لئے — رو رو کے دعا مانگنے والا تو کون؟

وہ جوش وہ اضطراب منزل میں کہاں — وہ شوقِ طلب تھکے ہوئے دل میں کہاں
شاعر کی تہ کو فلسفی کیا پہنچے — منجدھار کا زور شور ساحل میں کہاں

کتبہ عبدالمقتدر خوشنویس جلیسری